ماہنامہ

تجلّی

دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs. 7

62 N.P.

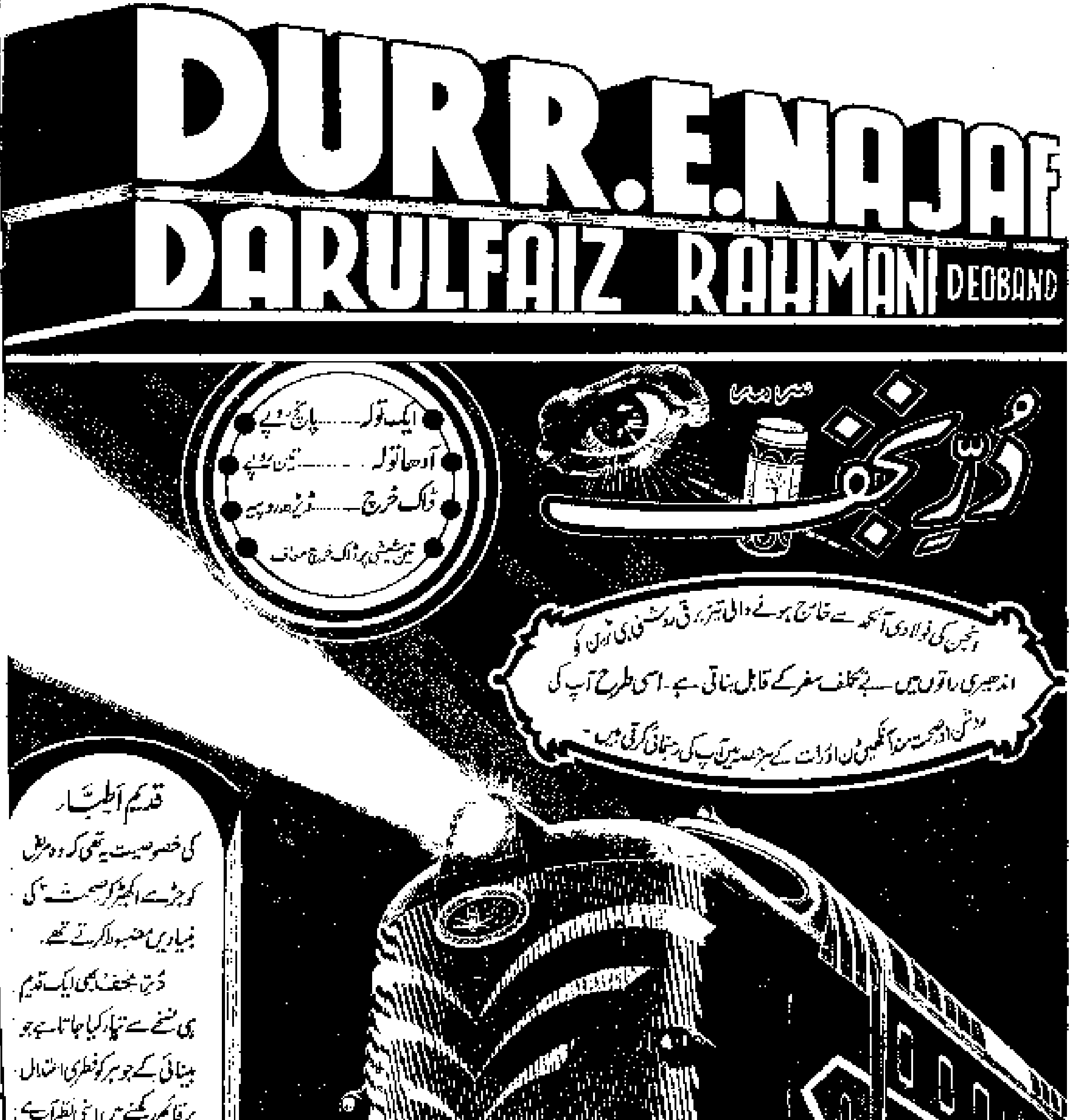
DURR.E.NAJAF
DARULFAIZ RAHMANI DEOBAND
ایک تولہ ...... پانچ روپے
آدھا تولہ ...... تین روپے
ڈاک خرچ ...... ڈیڑھ روپیہ
تین شیشی پر ڈاک خرچ معاف
دُرِ نجف
انجن کی فولادی آنکھ سے خارج ہونے والی تیز برقی روشنی ریل کو
اندھیری راتوں میں بے تکلف سفر کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح آپ کی
روشن اور صحت مند آنکھیں ان اوقات کے ہر حصہ میں آپ کی رہنمائی کرتی ہیں۔
قدیم اطبّاء
کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مریض
کو جڑی بوٹیوں سے اکسیر صحت کی
بنیادیں مضبوط کرتے تھے۔
دُرِ نجف بھی ایک قدیم
ہی نسخے سے تیار کیا جاتا ہے جو
بینائی کے جوہر کو فطری اعتدال
پر قائم رکھنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔
مرض اور صحت دونوں
حالتوں میں یکساں مفید۔
آخر عمر تک نگاہ قائم رکھنے کیلئے ہزاروں
لوگ دُرِ نجف استعمال کرتے ہیں۔
دار الفیض رحمانی۔ دیوبند۔
DURR.E.NAJAF

خ ـ ب ـ سراج الحسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ تجلّی دیوبند
شمارہ نمبر ۳و۲
جلد نمبر ۱۶

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے
سالانہ قیمت سات روپے ۔ فی پرچہ باسٹھ ۶۲ پیسے
غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

اشد ضروری

اگر اس دائرے ◯ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچے پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے ستّر پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیج کر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ مارچ و اپریل ۱۹۶۴ء

آغاز سخن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴
عامر عثمانی
اسلام پر ایک تازہ حملہ ۷
عامر عثمانی
تجلّی کی ڈاک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱
عامر عثمانی
مدرسۃ الاصلاح اور مولانا شاہ عبدالغنیؒ ۲۹
جلال الدین صدیقی
کیا ہم مسلمان ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵
شمس نوید عثمانی
بریلوی فتنہ ۴۵
محمد زین الدین
کھرے کھوٹے ۔۔۔۔۔۔۔ ۵۹
عامر عثمانی و شمس نوید

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلّی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی (پاکستان)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا۔

اس پتے پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیج دیں منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔
منیجر

آغازِ سخن

گزشتہ ماہ ہم نے ہفت روزہ "مبارک" سے اسکے فاضل مدیر کی "ایک عقیدتمندانہ گزارش" نقل کی تھی اور اس کے خاتمے اپنا مفصّل نوٹ بھی دیا تھا۔ ابھی ۴ مارچ کے مبارک سے پتہ چلا کہ صورتِ حال وہ نہیں ہے جس پر مدیرِ موصوف نے اپنی گزارش کی بنیاد رکھی تھی بلکہ معاملہ دوسرا ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب خود اپنے خرچ پر حج کو نہیں جا رہے ہیں بلکہ موصوف کے الفاظ میں۔

"حضرت شیخ الحدیث کا یہ عزم سفرِ حجاز و عرب بہت سے ممتاز علماء اور شیوخ کے سالہا سال کے پُر خلوص و مسلسل اصرار و اشتیاق کا رہینِ منت ہے۔ ورنہ ذاتی طور پر نہ ان کے حالات ایسے ہیں اور نہ ان کی جسمانی صحت ہی اس کی اجازت دیتی ہے۔"

چلئے۔ محترم شیخ الحدیث کی ذاتِ گرامی کی حد تک بات ختم ہوئی۔ لیکن "امام التبلیغ" مولانا محمد یوسف صاحب کا معاملہ اب بھی باقی ہے۔ خدا کرے ان کے بارے میں بھی کوئی ایسا ہی انکشاف ہو جس کا سہارہ لیکر ہم اس ناخوشگوار بحث سے اپنا دامن چھڑا سکیں۔

ویسے اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ظہور میں آیا ہے۔ مدیر مبارک کی گزارش پر کسی نے دینی دسترس کی وجہ سے اعتنا کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر یہ بہر حال اطلاع نامہ ضرور بن گئی۔ شیخین کے سفرِ حج کا۔ اطلاع پاتے ہی شیخ الحدیث مولانا زکریا مدظلہ کے ارادت مند اکڑ واسیاں لے لیکر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور مدیر مبارک کے الفاظ میں شیخ الحدیث کی جناب میں:۔

"ملک کے ہر گوشے سے متوسلین و معتقدین کے خطوط کا تانتا بندھ گیا ہے اور ہر شخص یہ درخواست کر رہا ہے کہ ہمیں بھی حضرت کی بزرگانہ رفاقت میں سعادتِ حج حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بعض متوسلین اس درجہ مضطرب ہیں کہ وہ اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ ہوائی جہاز میں بھی اگر سیٹ نہ ملے تو وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ اور ذرا تعجیل کر کے کسی بیرونی بندرگاہ سے حجاز پہنچ جائیں۔"

اس اقتباس سے صریح الفاظ میں تو یہ ظاہر نہیں کہ شیخ کی رفاقتِ سعیدہ میں ارادتمندوں کا "زیرِ تمنا" حج نفلی ہوگا یا فرضی ــــ لیکن قرینہ صریحاً بتا رہا ہے کہ بات نفلی ہی حج کی ہے فرضی کی نہیں ــــ فرضی ہوتا تو اس کی ادائگی شیخ الحدیث کے حج پر کیوں معلّق ہوتی۔

اب آگے ہم کیا کہیں۔ جس مسلکِ طریقت میں قلب و ذہن کا محور اور سعادت کا معیار حافظ شیرازی کا یہ شعر ہو۔

به مے سجّاده رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

که سالک بے خبر نبود ز راه و رسمِ منزلہا

اس کے حلقہ بگوشوں سے اس کے سوا امید بھی کیا ہو سکتی ہے کہ جب بھی دین و ملّت کے کسی خشک تقاضے اور سلوک و طریقت کے کسی رنگین داعیے میں تصادم ہوگا وہ مؤخر الذکر ہی کو ترجیح دیں گے۔

اللہ اللہ! اگر آخرت کے لئے یہی زاویۂ نظر مفید ہے تو ان حضرات کو جنت مبارک۔

امیروں کو مبارک ہو خدا ٭ غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

جائزہ نمبر

جائزہ نمبر بھی شاید لطیفہ ہی بنتا جارہا ہے۔ کہاں تو تجلی کا یہ ریکارڈ رہا کہ کہاوت کی زبان میں "چٹ منگنی اور پٹ بیاہ" اور کہاں اس نمبر کے سلسلے میں "اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ" والی مثل صادق آتی جارہی ہے۔ عذر و معذرت کا راگ چھیڑ کر اپنی کوتاہیوں کا جواز لانا کچھ زیادہ مشکل نہیں مگر شریف وہی ہے جو اپنے قصور کو ایچ پیچ کے بغیر تسلیم کرلے۔ شریف کہلانے کے لئے ہم برملا تسلیم کرتے ہیں کہ جائزہ نمبر میں اتنی دیر ہمارے تساہل اور بے توفیقی ہی کا ثمرہ ہے کسی اور پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ویسے معذوریاں ہم آپ کے سامنے رکھتے ہی رہے ہیں اور رکھتے وقت ہماری نیت بھی "بہانہ سازی" کی نہیں تھی لیکن نیت دل و دماغ کے جن خانوں میں سکونت رکھتی ہے ان کی آڑ میں چھپا ہوا ایک پُراسرار خانہ اور بھی ہے جسے "تحت الشعور" کہتے ہیں۔ اس خانے میں شاید پہلے ہی دن سے یہ خیال چھپ کر بیٹھ گیا تھا کہ وحید الدین خانصاحب کی کتاب "تعبیر کی غلطی" کو تنقید کی سان پر چڑھانا اسے پبلسٹی دینے کے مرادف ہوگا جب کہ نظر انداز کرنے کی صورت میں اس کے اثرات ایک محدود ترین حلقے سے آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ یہ خیال چپ چاپ اپنے پیر جماتا رہا مگر فہم و شعور کے دائرے میں ہم نے یہی تہیہ کیا کہ تنقید کا فرض ضرور ادا کریں گے۔ اسی تہیہ کے تحت مولانا ابو اللیث سے بھی ملے اور ان واقعاتی پہلوؤں پر بہت باتیں ہوئیں جو اس کتاب کے حصۂ مراسلت میں بکھرے ہوئے ہیں مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے والے تمام متعلقہ کاغذات ہمیں عنایت فرما دیں گے اور بذریعہ خط بھی اگر ہم ان سے اس سلسلے میں کچھ پوچھیں گے تو وہ اپنی دائم و قائم مصروفیات کے باوجود تشفی بخش جواب دینے میں تغافل نہیں برتیں گے۔

اس کے بعد ہم پروگرام بنانے لگے کہ فلاں فلاں کام سے فارغ ہوجائیں تب اطمینان سے خامۂ تنقید اٹھائیں گے۔ کاموں سے فراغت شاید بال ہا کا نام ہے۔ کہیں جیتے جی بھی "غم ہستی" سے فراغت ہوتی ہے، لیکن وہی چور جو تحت الشعور کی کوٹھری میں چھپا بیٹھا تھا قوتِ ارادی کو تھپکیاں دیتا رہا اور ذہن اس کاہل وجود شخص کی طرح مطمئن رہا جو کام سے بچنے کے لئے بہانوں کی تلاش میں رہتا ہے۔

حاصل یہ کہ اس کتاب کی تنقید کے سلسلے میں ہمارے ارادے اور عمل کے درمیان غیر معمولی فاصلے کا سبب اگرچہ اعذار و موانع ہی کا ایک سلسلہ رہا لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نفسیاتی وجہ خود ہمارے ہی ذہنی میلان کی کمی و آمادگی کی قلت تھی۔ میلان اور آمادگی میں خلل نہ ہوتا تو ہم موانع کو دفع کرنے میں طبعاً وہی مستعدی اور سرگرمی دکھلاتے جو عام طور پر ہماری طبیعت کا خاصہ رہا ہے۔ نہیں دکھلائی اور موانع کو "غنیمت" سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو سمجھنا چاہئے کہ خطا بقول شاعر ہمارے جذبۂ دل ہی کی تھی۔

اب آپ پوچھیں گے کہ آخر اس تمہید کا مدعا کیا ہے؟ ہم جواب دیں گے کہ تمہید در اصل یہ بتلانے کے لئے گانٹھی گئی ہے کہ "جائزہ نمبر" اگلے ماہ بھی نہیں آرہا ہے۔ اگلے ماہ عام ہی پرچہ آپ کو موصول ہوگا اور اگلے سے اگلا شاید جائزہ نمبر ہو — "شاید" کا التزام اب بھی اس لئے ضروری سمجھا کہ کون جانے شعور اور تحت الشعور کی مذکورہ نامطابقت بلکہ کشمکش آگے کو کیا رنگ لائے۔ عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ کتاب کا جائزہ لیا جائے مگر قوائے عمل کی رگوں میں لہو منجمد سا ہو کر رہ گیا ہے۔ خیال یہی ہے کہ جیت عقل کی ہوگی مگر "خیال" کو مشیت کا فیصلہ نہیں کہہ سکتے لہٰذا قارئین یقین مت کریں کہ اگلے سے اگلا پرچہ بھی نمبر ضرور ہی ہوگا۔ یقین اس وقت کیجئے جب اگلے شمارے میں اعلان آجائے۔ ایک مزیدار بہانہ یہ بھی ہاتھ آگیا ہے کہ کتاب کے جس نسخے کو پڑھ کر ہم نے جابجا نشانات لگائے تھے وہ خدا جانے کہاں گئی۔ آج ہی اسے اٹھا کر جائزے کی بسم اللہ کرنی چاہی تھی مگر تلاش میں ایک گھنٹہ ضائع ہوگیا اور وہ ہاتھ نہیں آئی۔ یا تو کوئی کرمفرما لے کر واپس کرنا بھول گئے یا ہمارے ہی کلبۂ احزان کے کسی کونے میں وہ

منھ چھپا کر پڑ گئے ہیں۔ یہ صورت جب ہو فی الوقت ناگزیر ہی ہے تو ان سے سوائے اس کے کیا کہیں کہ یہ داستان بہت پرانی ہو چکی اور ان دوستوں کو صبر جمیل کی توفیق دے جو نمبر کے لئے سراپا انتظار ہیں۔ اللہ ہمیں معاف کرے اور ان دوستوں کو بھی معاف کرے جو انتظار سے تنگ آکر ہمیں صلواتیں سناتے ہیں قطعاً حق بجانب ہوں گے۔

مظلومین کلکتہ کے لئے تعاون کی جو اپیل ہم نے کی تھی، الحمد للہ وہ مؤثر رہی۔ لیکن معاون حضرات سے ہم التماس کریں گے کہ جو کچھ بھیجنا ہو وہ براہ راست انھی پتوں پر بھیجیں جنھیں ہم نے اپیل کے اختتام پر چھاپ دیا ہے۔ عامر عثمانی یا ادارہ تجلی کو بھیجنا غیر موزوں ہے۔ اب تک جو کچھ یہاں موصول ہوا وہ بذریعہ منی آرڈر کلکتہ بھجوا دیا گیا ہے اور شکر کی جا ہے کہ کم سے کم فیس منی آرڈر کی حد تک ادارہ تجلی بھی ثواب میں شریک ہو ہی گیا ہے۔ لیکن منی آرڈر فیس مظلومین کے حصے میں تو نہیں آتی لہٰذا گھماؤ کی راہ اختیار کرنے سے حاصل۔

مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ دوسروں کو تعاون کا سبق دینے والا ادارہ تجلی خود اپنا دست تعاون منی آرڈر فیس سے آگے دراز نہیں کر سکا ہے۔ ہمیں مطلب صرف یہ عرض کرنا تھا کہ ان منی آرڈروں کی حد تک ہماری شرکت محض فیس ہی کی رہی ہے۔ ورنہ اتنا کم سواد تو بہرحال ادارہ تجلی بھی نہیں ہے کہ خود را فضیحت دیگراں را نصیحت کی تصویر بن کر بیٹھ جاتا۔ الحمد للہ اپنی وسعت کے مطابق اس نے بھی کچھ کیا ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وسعت کا حجم اب اس کی کارکردگی کو انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل کا مصداق ٹھیراتا ہو۔ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ۔

یہ شمارہ اضافۂ صفحات کے بغیر ہی آپ "مارچ و اپریل" کا دیکھ رہے ہیں۔ اس کا مقصد خریداروں کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اس بے قاعدگی کو دور کرنا ہے جو ایک ماہ کے التواء سے پیدا ہو گئی ہے۔ خریدار مطمئن رہیں کہ ان کی سالانہ خریداری کے حساب میں یہ پرچہ ایک ہی ماہ کا شمار ہوگا۔

تجلی کے دو شاندار نمبر

جو حضرات ان نمبروں کو نہ دیکھ پائے ہیں ان کے لئے مسرت بخش پیشکش

خاص نمبر ۶۳ء — نوع بہ نوع دلچسپیوں اور علمی جواہر پاروں کا دلکش مجموعہ۔ مدیر تجلی کے قلم سے متعدد اہم اور نازک سوالوں کے مدلل و مفصل جوابات۔ آغاز سخن میں ایک عجیب حادثے کی حیرت خیز کہانی — صفحات سو سے زائد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ڈاک نمبر ۶۴ء — یہ تو ڈاک نمبر ہی ٹھیرا۔ علم و تفقہ اور انشاء کے حسن سے بھرپور درجنوں سوالات کے دلنشیں اور بے لاگ جوابات۔ پھر ملا بھی ایک گزبرا مفتی کے روپ میں! — قیمت سوا روپیہ۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

سرمہ دُرِّ نجف

ایک جانا پہچانا سرمہ۔ جسے کسی تعارف و اور تعریف کی ضرورت نہیں

آپ حالت صحت و بحالت مرض دونوں میں اسے استعمال کرتے رہیں کیونکہ آنکھوں کے امراض دور کرنے کے علاوہ یہ نگاہ کو قائم رکھنے میں بھی اپنی نظیر آپ ہے۔

ایک تولہ پانچ روپے — چھ ماشہ تین روپے

ڈاک خرچ ڈیڑھ روپیہ

کوئی سی بھی تین شیشیاں یکجا طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف

(طلب کرنے پر خالص جستی کیمیائی سلائی بھی ساتھ بھیجی جاتی ہے جس کی قیمت ۳ روپے ہے)

دار الفیض رحمانی۔ دیوبند یو۔پی

اسلام پر ایک تازہ حملہ

ہم سب کی فوری توجہ کا طالب

جان ومال پر کئے جانے والے حملوں سے تو ہم اس درجہ مانوس ہوچکے کہ اب ان کے تذکرے میں کوئی ندرت نہیں لیکن آج تذکرہ ایک ایسے حملے کا ہے جو ہمارے جان ومال پر نہیں بلکہ ہماری سب سے عزیز اور قیمتی متاع "اسلام" پر کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل پیش کرنے کے لئے موزوں ہے کہ ہم "انوار اسلام" کا ذکر چھیڑیں "انوار اسلام" حافظ امام الدین رام نگری کے ماہنامے کا نام ہے جس کا ذکر پہلے بھی کئی بار تجلی میں آچکا ہے۔ آنجہانی سوامی دیانند جی کی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" کی حد درجہ زہریلی اور اسلام دشمن موشگافیوں کے جواب میں ہندی زبان وادب اور ہندو مت کے نبض شناس جناب حافظ امام الدین اپنے ماہنامے کے کئی مستقل ایشوع منظر عام پر لا چکے ہیں اور اس وقت جنوری و فروری سنہ ۸۲ء کا جو شمارہ ہمارے سامنے ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے مگر اس میں اضافہ ایک اہم چیز کا ہے جس پر ہم سب مسلمانوں کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے

ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی تو چل کر دکھ ہوئے اور وہیں پہنچ گئے جہاں اعداء اسلام کا مقدر ہے۔ اب ایک بزرگوار پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے چلے ہیں اسلام دشمنی کے خاکے میں نیا رنگ بھرنے اور عقل کے نام پر وہ بے عقلی پھیلانے جو ریس کے اس دور میں ہزاروں سال پہلے کی جاہلیت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ فرق آنجہانی اور اپادھیائے جی میں بس اتنا کہ آنجہانی کی زبان بازاری، لب ولہجہ پھوہڑ پاٹی اور تیور کسی کثیر العیال جیسے تھے مگر اپادھیائے جی کی زبان ذرا شستہ، لہجہ قدرے تمیز نما اور تیور تیکھے قسم کے ہیں مگر یہی خوبیاں ان کی شر انگیز قلم درازیوں کو کم سے کم جاہلوں اور بے عقلوں کے لئے دام ہم رنگ زمین کا درجہ عطا کرتی ہیں۔

خیر سے انہوں نے ایک ضخیم کتاب چھاپی ہے "مصابیح الاسلام" اور اردو ہندی دونوں میں چھاپی ہے۔ ہندی نام ہے "اسلام کے دیپک"۔ حاصل اس کتاب کا یہ ہے کہ نہ تو محمد عربی ﷺ خدا کے رسول تھے نہ قرآن خدا کی کتاب ہے نہ اسلام کوئی ڈھنگ کا مذہب ہے۔ مذہب اگر کوئی ہے تو بس وہ جس پر خود مصنف قائم ہیں اور بہترین الہامی کتابیں اگر کوئی ہیں تو وہ ___ جن کی عمر کا تقریباً ۹۰ فیصدی حصہ تاریخ کے اندھیاروں میں گم ہے۔

اس "حاصل" کو پوری کتاب میں جس تک بندی اور شعبدہ گری کی جن مجوبہ کاریوں کے ذریعہ پھیلایا گیا ہے وہ بھی قابل دید ہی ہیں۔ اس کے اقتباسات پڑھ کر ہمیں تو بے اختیار وہ کسان یاد آگئے جن کی کھیتی کو ایک بار سورج کی حدت نے جلا ڈالا تھا اور اس پر انہوں نے روزانہ صبح و شام سورج کو انگوٹھا دکھانا اور اس کی طرف منہ کرکے گندے پانی کی کلیاں کرنا عبادت قرار دے لیا تھا۔ اس گروہ کے بارے میں ہمارے پاس مضبوط دستاویزی شہادتیں تو بے شک نہیں مگر ایسی دلیلیں ضرور موجود ہیں جو ان دلیلوں سے تو بہر حال مضبوط اور قرین عقل ہیں جنہیں ستیارتھ پرکاش یا مصابیح الاسلام جیسی کتابوں میں چاند پہ تھوکنے اور عین حماقت کو دانشمندی قرار دینے کی خاطر جمع کیا گیا ہے۔ کاش کوئی ایسی عدالت ہوتی جہاں مذہبی گفتگو کے معاملہ میں جھوٹ، بے ایمانی، دغا بازی، تحریف و تلبیس اور گندہ ذہنی کی سزا ننگے جسموں پر ہزار کوڑوں کی مار ہوتی تو خدا کی قسم ہم مذکورہ قسم کے مصنفوں کو وہاں ضرور لے جاتے اور وہ سارا فکری

سرمایہ ان کے سامنے رکھئے جس میں انہوں نے ہمارے اور ہم نے ان کے مذہب کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ اسلام کبھی نقد وایراد کا سامنا کرنے سے نہیں گھبرایا۔ گھبرائے وہ جو لکڑی کے پیروں پر کھڑا ہو۔ زمین کی تہہ میں جڑیں پھیلانے والا تناور درخت آندھی اور طوفان سے کیا ڈرے گا۔ اسلام کے دشمنوں نے ایک بار نہیں ہزاروں بار مجتمع ہو کر اسلام کے سربفلک قصر کو ڈھانے کی کوششیں کی ہیں اور علم وجہل کے سارے ہتھیار پوری شقاوت عزم اور بے رحمی کے ساتھ آزما لیئے ہیں مگر نتیجہ کچھ ایسا ہی نکلا ہے جیسے یہ سب دیو اور بالشتیوں کا کھیل رہا ہو جیسے زخمی شیر پر کچھ مکھیاں بھنبھنائی ہوں۔ جیسے ہاتھی کو لومڑیوں نے گھیرنے کی کوشش کی ہو۔ اسلام ہر معرکہ سے گردن افراز نکلا ہے اور آتش حسد سے خاک ہونے والے اعداء اسلام لکھ لیں کہ وہ اب بھی ہر معرکہ سے کامیاب ہی نکلے گا۔ احمق سمجھتے ہیں کہ زمین کے کسی قطعہ میں اگر مسلمانوں کو ہم نے جسمانی طور پر مغلوب کر لیا ہے تو اب اسلام بھی ہمیں جھک کر سلام کرے گا اور ہم اس کے لب ولعل کی سرخی بنا سکیں گے مگر یہ نہیں جانتے اور نہیں جان سکتے کہ اسلام سورج کی طرح ناقابل تسخیر سمندر کی طرح بے پایاں اور زندگی کی طرح ہمہ گیر ہے۔ وہ اس وقت بھی مغلوب نہیں ہوگا جب پوری دنیا میں اللہ کا نام لینے والے گنتی ہی کے چند افراد ہی کیوں نہ رہ جائیں۔

کتنی ڈھٹائی، کورچشمی اور کند ذہنی کی بات ہے کہ اعتقادی ہی نہیں بلکہ عقلی سطح پر بھی دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اسلام محض لغو ہے اور وہ مذہب عقل کے عین مطابق ہے جس کے اصول وعقائد کی کوئی عقلی بنیاد دور دور موجود نہیں۔ کاش اتنا ہی دیکھ لیا جاتا کہ وقتاً فوقتاً دنیا کی بعض معروف ہستیاں اگر اپنے مذہب کو ترک کر کے کسی اور مذہب کو اختیار کرنے کا اعلان کرتی رہتی ہیں تو وہ کونسا مذہب ہے۔ کیا کوئی صاحب بتلانے کی زحمت گوارہ کریں گے کہ دو تین صدیوں پر پھیلے ہوئے اس دور حاضر میں جسے عقل کی ترقی اور سائنس کا دور کہا جاتا ہے ہندوستان سے باہر کی دنیا کے کسی ایک بھی جلتے بجھتے دانشور نے یہ اعلان کیا ہو کہ میں اپنے مذہب کو چھوڑ کر آریہ سماجی یا ویدک دھرمی بن رہا ہوں۔ دس بیس نہیں فقط ایک شخص کا نام بتا دو جو تھوخیرا کی سطح سے کچھ بلند ہو اور اس نے تمہارے واحد عقلی مذہب کے آستانے پر اعتراف کی پیشانی ٹیک دی ہو۔

اس کے برخلاف ہم تمہیں ایک دو نہیں جتنے کہو نام ایسی شخصیتوں کے بتا سکتے ہیں جو اپنی جگہ ممتاز شخصیتیں تھیں اور انہوں نے اسلام کی عقلی وروحانی عظمت کے آگے اپنے علم وفراست کی پیشانی ٹیک دی اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ ہم آج سے مسلمان ہیں۔ مشک وہ ہے جو خود بولے وہ نہیں جسے مشک ثابت کرنے میں خود عطار کو جھک مارنی پڑے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک اسلام کا دریائے رواں بہہ رہا ہے اور یہ اس صورت میں بہہ رہا ہے جبکہ اس کے پیرو اپنی بداعمالیوں اور بے وفائیوں کے باعث اس کی بڑھتی ہوئی رفتار کے آگے روڑے اور دیوار بن گئے ہیں۔ اگر دنیا کی بدقسمتی سے مسلمان ہی اسلام سے دغا بازی نہ کرتے بلکہ اسلام کا عملی نمونہ بن کر دکھلاتے تو تم دیکھتے اور دنیا دیکھتی کہ فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہونے کا جو منظر چشم فلک نے آغاز اسلام میں دیکھا تھا وہی بعد کے زمانوں میں بھی نظر آ رہا ہے۔ انسانی عقل ووجدان اور ضمیر وفطرت کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ لازوال صداقتوں اور لافانی حقیقتوں کے مخزن جلیل ــ اسلام کی بارگاہ میں سپر نیاز خم کر دیں۔ مبارک ہو شیطان اور اسکی ذریت کو کہ مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی کو اسلامی خطوط سے ہٹا کر خود ہی کفر وزندقہ اور جہالت وضلالت کا راستہ صاف کر دیا اور کچھ کوتاہ آستینوں کو یہاں تک جسارت ہو گئی کہ فکر ونظر کے میدان میں بھی اسلام کو للکار سکیں۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اسلام پر عقل ومنطق کے زاویے سے کئے گئے کسی بھی اعتراض کو مسلمانوں نے کبھی ممنوع قرار نہیں دیا نہ اس پر جھلائے اور نہ برا منایا ـــــ مگر عقل ومنطق کی بجائے اگر لوگ خیانت، چارسو بیسی، دروغ بافی، مغالطہ انگیزی اور شرارت کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہوں اور زبان

بھی اشتعال انگیز اور غیر متین استعمال کریں تو پھر شکایت
پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ ہمیں شکایت ہے کہ دونوں ہی متذکرہ
کتابوں میں اسلام کے خلاف ایسے ہی ہتھیار استعمال کئے
گئے ہیں اور اسلام کے غلاموں نے اپنے دور اقتدار تک میں
جو شرافت و احتیاط دوسرے مذاہب کی تنقید میں برتی ہے
اس کا صلہ بڑی کم ظرفی اور خیرہ چشمی سے دیا گیا ہے۔

مگر شکایت پر کان کون دھرتا ہے مصیبت تو یہ آن
پڑی ہے کہ یہ کتابیں علمی و عقلی سطح سے کتنی ہی گری ہوئی ہوں
مگر ماحول میں جاہلیت اتنی رچی بسی ہے کہ عام طور پر انکی پست
سطح کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اور اسلام سے متنفر کرنے والے
جو خیالات ابنائے وطن کے دل و دماغ میں پیوست کر دیئے
گئے ہیں ان کی شدت میں اضافہ کرنے کا پارٹ یہ کتابیں اپنی
بے مائگی کے باوجود ادا کر ہی جاتی ہیں اس لئے ضروری ہے
کہ ان کا شایان شان رد کیا جائے۔

ہمارے حافظ صاحب ہندی کے بڑے اچھے عالم ہیں
اور خدمت اسلام کا جذبہ بھی ان میں اللہ نے خوب خوب عطا
فرمایا ہے۔ اپنی کبر سنی اور مالی تنگ دامانی کے باوجود وہ "ستیارتھ
پرکاش" کے نام نہاد باب کا رد کر ہی رہے تھے کہ اب
اس نئے فتنے "مصابیح الاسلام" کا چیلنج بھی نہ صرف
قبول کر بیٹھے ہیں بلکہ اللہ کا نام لیکر اپنے بیٹے کو بطور سپر
پیش بھی کر دیا ہے۔ جزاہم اللہ خیرالجزاء۔

اب یہ تو آدمی کے بس میں ہے کہ حمیت کے جوش میں
اپنی مٹھی بھر ہڈیاں توپ کے دہانے پر رکھ دے مگر بس
میں نہیں کہ بغیر پیسے کے کتاب چھاپنا تو درکنار پیٹ میں دو روٹیاں
بھی ڈال سکے "مصابیح الاسلام" کا جواب کم و بیش پانچ سو صفحات
کا طالب ہے اور اتنی ضخامت کی کتاب معمولی معیار پر ہزاروں
سے کم میں نہیں شائع ہو سکتی۔ حق خدمت تو اسی صورت میں ادا
ہوتا کہ یہ اردو اور ہندی دونوں میں چھپتی جیسے کہ "مصابیح الاسلام"
چھپی ہے اور اسی فراخ دلی سے تقسیم ہوتی جیسے مصابیح تقسیم
ہو رہی ہے مگر یہ منزل کہاں۔ ابھی تو آس لگائے ہیں کہ فقط اردو
کی ایک ہی اشاعت مر مار کے آ جائے۔

ہم نے تجلی کے لئے کبھی کاسہ گدائی ہاتھ میں نہیں لیا مگر ہمارا ضمیر،
ہمارا ایمان اور ہماری غیرت تلملا رہی ہے کہ ہم حافظ صاحب
کی دینی خدمات کو یاد آور کرنے کیلئے بھکاریوں کی طرح
اپنے مسلمان بھائیوں سے عرض و التجا کریں۔ ہم ان سے کہیں
کہ خدا را حافظ صاحب کی جگر سوزیوں کو ضائع ہونے سے بچاؤ
اور اس وقت سے ڈرو جب مالک الملک پوچھے گا کہ ہندوستان
کا ایک بوڑھا اور غریب مسلمان جب اسلام پر کئے جانے
والے شر انگیز حملوں کے جواب میں اپنے دل و دماغ اور اعضاء
کی ساری بچی کھچی پونجی سمیٹ کر محاذ پر پہنچ گیا تھا اس وقت تم کہاں
تھے اور تم نے کیوں نہیں دیکھا کہ اس بوڑھے نے تمہیں آوازیں
دیتے دیتے دم توڑ دیا۔ دوستو! تمہیں اگر خدا نے کچھ فاضل دولت
دی ہے تو خدا کی قسم بڑے زرین موقعے ہاتھ آ رہے ہیں کہ ایک
ایک پیسے کے بدلے خدا سے لعل و جواہر لے لو۔ ادھر کلکتے
کے مظلومین کی امداد تمہارے پیسے کا بہترین مصرف ہے۔
دوسری طرف یہ ذہنی و قلمی محاذ بھی ——— جس پر خدا کا ایک
غیرت مند بندہ حافظ امام الدین رام نگری آگے آگے جا رہا
ہے کوئی معمولی مصرف نہیں۔ خیر جاری کا اجر کبھی ختم نہیں
ہوتا۔ ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب اور مصابیح الاسلام
کے "دوز بانی" ایڈیشن اگر فتنۂ جاریہ ہیں تو کتابی شکلوں
میں ان کے جواب بھی ہم غلامانِ اسلام کے نزدیک یقیناً خیر
جاریہ ہوں گے۔ خصوصاً موجودہ فضا میں ابنائے وطن کی غلط
فہمیاں دور کرنے والا لٹریچر تو ایک اہم ترین ضرورت کی حیثیت
اختیار کر گیا ہے۔ یہ آئے دن کے فسادات بنیادی طور پر نفرت
ہی سے تو جڑے ہوئے ہیں اور نفرت کی تخم ریزی ایسے ہی
باطل پروپیگنڈوں نے کی ہے جن کا ابھرا ہوا نمونہ یہ دونوں
کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ پھیلائی گئی نفرت و عداوت
کو اپنی استطاعت بھر دور کرنا اور اسلام کے صحیح خد و خال
فریب خوردہ عوام کے سامنے رکھنا ہمارے لئے دنیا و
دین دونوں ہی کی مصالح کے پیش نظر از حد ضروری ہے۔

تعاون کی ایک سہل اسکیم

ویسے تو ارباب
خیر کچھ نہ کچھ تعاون

حافظ صاحب کو دے رہی رہے ہیں اور انوار الاسلام میں اس کا تذکرہ آتا رہتا ہے لیکن یہ تعاون ضرورت سے بہت کم ہے حافظ صاحب نے یہ اسکیم پیش فرمائی ہے کہ تازہ انوار الاسلام میں "مصابیح الاسلام" کا جو ابتدائی حصہ تقریباً ۳۰۰ صفحات میں پیش کیا گیا ہے اسی کو وہ علیحدہ کتابی شکل میں لا رہے ہیں اب جو حضرات تعاون کا جذبہ تو رکھتے ہیں مگر تعاون دینے کے لائق فاضل دولت نہیں رکھتے وہ حافظ صاحب کو خط لکھکر اس کتاب کے جتنے چاہے نسخے مفت منگالیں اور پھر اپنے حلقۂ تعلق میں اس کی اہمیت و ضرورت سمجھا کر ایک روپیہ فی نسخہ کے اعتبار سے بیچ ڈالیں۔ کسی بھی غریب سے غریب مسلمان کو ایک روپیہ دینا گراں نہ گذرے گا اگر اس کے دماغ میں بات اتر گئی اس طرح ہر شخص تھوڑی سی کوشش سے کچھ نہ کچھ روپے حافظ صاحب کو بھیج سکے گا اور قطرہ قطرہ مل کر اتنے پانی کا امکان ہو جائے گا جس سے پوری کتاب چھاپنے کے اخراجات کی پیاس بجھائی جاسکے۔

یہ مضمون اس لئے نہیں لکھا گیا کہ آپ بس پڑھ کر چپ ہو جائیں۔ آپ کو فوری طور پر اپنے بس بھر تعاون دینا چاہئے اور اس داغ سے جس کے ساتھ خدا کے حضور پہنچنے سے پناہ مانگنی چاہئے کہ ایک بوڑھا مجاہد کفر و اسلام کے محاذ پر آخری سانس تک آپ کو مدد کے لئے پکارتا پکارتا مرگیا مگر آپ نے اس کی پکار گوش لاپروائی سے سنی اور نظر انداز کر دی۔ ہر گذرنے والا لمحہ ہم سب کو قبر کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے اور بہت جلد۔ بہت ہی جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ایسی ہی دولت ہمارے کام آئے گی جسے ہم دنیا میں دین و ملت کے لئے خرچ کر گئے۔ کیا تم نے نہیں سنا اللہ نے اب سے تقریباً چودہ سو سال پہلے فرمایا تھا۔

إِنَّا أَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ

اے لوگو! ہم تمہیں ڈراتے ہیں ایک بہت ہی قریبی عذاب سے۔ ایک ایسے دن سے جب ہر شخص دیکھ لے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے۔

اور دیکھو ہمارا رب کیسے مربیانہ ڈھنگ میں کہتا ہے۔

وَأَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِيْ إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اور جو کچھ ہم نے تمہیں مال و منال عطا کیا ہے اس میں سے نیک کاموں میں صرف کرلو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کا وقت اجل آپہنچے اور پھر وہ حسرت کرنے لگے کہ اے معبود آپ نے تھوڑی سی مہلت مجھے اور کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات کر لیتا اور نکوکاروں میں شامل ہو جاتا (سمجھ گیا ہوگا اس حسرت سے جبکہ) موت کا وقت معین آجانے کے بعد اللہ کسی کو پل بھر کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ اور اللہ پوری طرح باخبر ہے تمہارے تمام اعمال سے۔

عجیب زمانہ آگیا ہے۔ قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرنیوالے کتنے ہی مسلمان فضول رسموں اور طمطراقانہ مشغلوں میں بے اندازہ دولت صرف کر دیں گے مگر دین و ملت کے اہم ترین کاموں کے لئے ان کی تھیلی کا منہ بخیل کے دروازے کی طرح بند ہوگا۔ کیا چیز تھی ایک پانچ چھ سو صفحات کی کتاب کی اشاعت۔ خیریت دینی اور رابطۂ ملی کے ذہنی زاویئے درست ہوتے تو فقط ایک آواز پر اس کتاب کے ڈھیر لگ جانے چاہئیں تھے مگر وائے فساد قلب و نظر۔

مگر اپنی سالانہ دستک کو ہم طنز و طعن پر نہیں اس عاجزانہ التماس پر ختم کرنا چاہتے ہیں کہ للہ بے اعتنائی نہ برتنا اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ حافظ صاحب کی مالی مدد کر کے تم نے ان کی ذات پر احسان کیا ہے یہ تو تمہارا اپنا فریضہ ہے اور خوش قسمت ہو کہ ایک نیک کام میں تعاون کا تمہیں موقع اور توفیق ملی۔ ہاں عامر عثمانی کی گردن پر تمہارا احسان ضرور ہوگا کہ تم نے اس کی استدعا کو ہاتھ حقارت سے نہیں ٹھکرایا اور یہ عاجز ان شاء اللہ خدا کے یہاں برملا تمہارے احسان و عنایت کا اعتراف کرے گا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

تجلی کے خریدار دفتری خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں ورنہ تعمیل حکم دشوار ہوگی۔ — منیجر تجلی دیوبند

تجلی کی ڈاک

اسلام اور تفریحات

سوال ۱:- از محمد اکرم ۔۔ لاہور

فاران ۔ فروری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ایک دردمند خاتون کا خط مدیر فاران کے نام شائع ہوا ہے ۔ فاضل مدیر نے جواب بھی دیا ہے مگر دل کی تشفی نہیں ہوئی ۔ جی چاہتا ہے کہ آپ ہی سے اس کا جواب ملے تاکہ تسلی ہو سکے ۔ کالج میں ہمارے کچھ دوست ایسے ہیں کہ جب ان سے میں کہتا ہوں کہ سینما، رقص و سرود، موسیقی، ڈرامائی نٹو، ڈرامے وغیرہ میں حاضری دینا اسلامی روح کے خلاف ہے کیونکہ یہ ساری چیزیں ہمیں کاہلی، تن آسانی اور عیاشی کی طرف مائل کرتی ہیں اور اس طرح ہمیں اپنے فرائض منصبی سے غافل کرتی ہیں ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ پھر تو اسلام بڑا ہی خشک مذہب ہے اور اس میں تفریح کا کوئی تصور ہی نہیں ہے ۔ ہر طرف بوریت ہی بوریت ہے ۔ دل بہلانے کے لئے سب چیزیں اس میں ناجائز ہیں ۔ ان کا سب سے مضبوط استدلال یہ ہے کہ موسیقی کی طرف تو ہر انسان کا فطری رجحان ہے اور ہر روح وجد میں آجاتی ہے ۔ پھر اسلام جو فطری دین ہونے کا دعویدار ہے ہمیں فطرتِ انسانی کے اس تقاضے سے کیوں باز رکھتا ہے ؟ اور ہمیں اس سے محظوظ ہونے کی اجازت کیوں نہیں دیتا۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں مشینی دور کی وجہ سے ہر آدمی از حد مصروف ہے اور دن بھر کام کرنے کے بعد ہر آدمی کا دل تفریح کو چاہتا ہے اور یہ ریڈیو پر موسیقی، سینما اور کلبوں کی تفریح ایک آدمی کے لئے بہت حد تک بوریت کو ختم کرنے کا سامان مہیا کر دیتی ہے ۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے از راہ کرم مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات ارشاد فرمایئے :-

(۱) کیا اسلام میں اس قسم کی تفریح کا کوئی تصور ہے (۲) اگر نہیں تو اسلام اس کا کیا متبادل پیش کرتا ہے ؟ (۳) اگر کوئی متبادل بھی نہیں تو اسلام کی طرف سے اس عام بیزاری کو دور کرنے کے کیا طریقے ہیں ؟

الجواب ۱:-

فروری کے فاران میں مذکورہ خط اور اس کا جواب ہم نے پڑھ لیا ہے ۔ جواب اصولاً کافی و شافی ہے لیکن اس سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی تو ضروری نہیں کہ ہمارا ہی جواب تشفی بخش ہو سکے ۔ کوشش ہم ضرور کریں گے ۔ نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے ۔

اس سے قبل کہ ہم تفریح کے سلسلے میں اسلام کا موقف پیش کریں یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ کسی بھی سنجیدہ موضوع پر بحث کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اگر تمام شرکاء بحث موضوع کی واجبی اہمیت کا احساس کرنے میں پوری طرح سنجیدہ نہ ہوں مثلاً سائنس یا سیاست یا کسی بھی وسیع علم و فن کا کوئی مسئلہ چھڑ جائے تو اس کی گتھیاں سلجھانا ایسی ذہنی کیفیت میں ممکن نہیں جب آدمی چلتے ہوئے فقروں اور طنز و طعن یا تمسخر اور تفنن سے کام نکال لے جانا چاہتا ہو آپ کتنی ہی قوی دلیل کسی دعوے کے اثبات میں پیش کر دیں مگر یہ غیر مؤثر ہی رہے گی اگر مخاطب بردباری کے ساتھ اس پر توجہ دینے کے موڈ میں نہ ہو۔

اسلام ظاہر ہے ایک سنجیدہ تر موضوع ہے ۔ بلکہ اس لحاظ سے تو وہ دنیا کے ہر دوسرے موضوع سے زیادہ اہم اور متین موضوع ہے کہ اس پر آخرت کی ابدی زندگی کے سود و زیاں کا مدار ہے لیکن

ہو یہ رہا ہے کہ جس طرح کے دوستوں کا آپ نے تذکرہ فرمایا اس طرح کے خوش فکر حضرات نسلاً اور رسماً مسلمان ہونے کے باوجود کوئی قابل ذکر لگاؤ اسلام سے نہیں رکھتے۔ وہ کافر نہیں ہیں مگر مرّوجہ تعلیم و تربیت اور ماحول نے ان کے ذہن کا رابطہ اسلام سے اس حد تک کاٹ دیا ہے کہ اب ان کی دنیائے خیال میں اسلام سرے سے کوئی موضوع ہی نہیں رہا۔ ان کے طرزِ زندگی، ان کے مشاغل و معمولات اور ان کے میل ونہار پر آپ نظر ڈالیں گے تو ان کے آئینہ میں صاف طور پر آپ کو ایسا ہی ذہن کارفرما نظر آئے گا جو مادّی منفعتوں کے حصول اور دنیاوی آسائشوں کی جستجو میں منہمک ہو کر مذہب و اخلاق اور مرنے کے بعد کی زندگی کے تمام مسائل سے اپنی دلچسپیاں منقطع کر چکا ہے۔ اگر ان کی محفل میں اسلام کے کسی حلال و حرام کا ذکر چھڑ ہی جاتے تو یہ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اتنی سنجیدگی بھی اختیار نہیں کریں گے جتنی کسی علمی موضوع کے لئے کم سے کم درجے میں ضروری ہوا کرتی ہے۔ سنجیدگی ماتھے پر سلوٹیں ڈالنے کا نام نہیں علم و فن کے سلسلے میں جب سنجیدگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے ذہن کی ایسی کیفیت جو احساسِ ذمہ داری، معقولیت اور حقیقت پسندی کے عناصر سے ترکیب پائی ہو۔ اس کیفیت کی موجودگی میں آدمی سب سے پہلے خود اپنے اندرون کا جائزہ لیکر دیکھتا ہے کہ جو موضوع زیرِ گفتگو ہے اسکے بارے میں اس کے علم و واقفیت کا طول و عرض کیا ہے اور کس حد تک وہ اظہارِ رائے کا مجاز ہے۔ اس کے بعد وہ لب و لہجے کو موضوع کے شایانِ شان بناتا ہے اور اس کے اندازِ کلام میں استہزاء یا فقرے بازی یا لاپرواہی کی شان نہیں ہوتی۔

لیکن کالج کے جن نونہالوں کا آپ نے ذکر فرمایا ان کی شان تو اور ہی ہے۔ وہ تو فی الحقیقت ان تنکوں کی مانند ہیں جو کسی تیز و تند سیل کے دھارے میں چار و ناچار بہے چلے جا رہے ہوں۔ ان کے دل و دماغ کو مادّہ پرستانہ تعلیم و تربیت نے اپنے خاص رنگ میں رنگ لیا ہے اور ماحول کی گرفت ان کے اعصاب پر اتنی شدید ہے کہ اپنے لگے بندھے راستے کے سوا ان کا ذہن شاید ہی کسی اور موڑ مڑنے کی صلاحیت محفوظ رکھ سکا ہو۔

●

اب اپنے استفسار کا جواب سُنئیے۔ یہ جواب ذرا تفصیلی ہوگا تاکہ مسئلے کے سارے پہلو روشنی میں آجائیں۔

ہمیں اس مطالبے سے کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لئے کچھ نہ کچھ سامانِ تفریح ضرور ہونا چاہئیے۔ خود اللہ کے رسولؐ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے!

لیکن یہ بات آپ بھی مانیں گے اور دنیا کے سارے ہوشمند مانتے ہیں کہ انسان کو اس کی خواہشات کے سلسلے میں لامحدود آزادی نہیں دی جا سکتی بلکہ اجتماعی مفاد اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ کی خاطر اصول و ضوابط کی کچھ دیواریں ضرور کھڑی کرنی ہوں گی۔ مثلاً انسان کی طبعی خواہش ہے کہ پیٹ میں جو غذا اسے حلق کے راستے اُتارنی ہے وہ خوش ذائقہ بھی ہو لیکن دنیا کے کسی قانون نے کبھی یہ آزادی فرد کو عطا نہیں کی کہ وہ جس دکان پر خوش ذائقہ غذا ہیں دیکھے بلا تکلف اُٹھا کر کھالے۔ یا مثلاً جنسی خواہش آدمی کی قوی ترین جبلّت ہے۔ اس جبلت کی آسودگی کا تو صرف اسے حق دیا گیا ہے بلکہ وہ فطرتاً مجبور ہے کہ اس کی آسودگی کا راستہ نکالے مگر اس شدید ضرورت کے سلسلے میں بھی دنیا کے کسی مہذب قانون نے کامل آزادی کا حق تسلیم نہیں کیا یہاں تک کہ آج کا قانون بھی ـــ جس میں زنا کوئی جرم نہیں ہے جنسی تعلّق کے جواز کو باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے اور جبر کو جرم قرار دیتا ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ "تفریح" کے سلسلے میں انسان مکمل طور پر خود مختار چھوڑ دیا جائے اور اصول و ضوابط کی کوئی چٹان اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ "تفریح" تو ویسے بھی ایک مبہم اور وسیع الاطلاق لفظ ہے۔ اس کا ابہام دور ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے مفہوم کی لامحدود وسعت کو بعض اصولوں اور قاعدوں کی چار دیواری سے گھیر نہ لیا جائے۔ گھیر نا یوں بھی ضروری ہے کہ مزاجوں اور طبیعتوں کی رنگا رنگی کی کوئی حد نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک ہی فعل و شغل کچھ لوگوں کی نظر میں بیزار کن اور نفرت انگیز ہوتا ہے مگر کچھ اور لوگ اسے اپنے لئے بہترین تفریح قرار دیتے ہیں۔ ایسے افراد

کی بھی دنیا میں کمی نہیں رہی اور آج بھی کمی نہیں ہے جنھیں دوسروں کو اذیت پہنچانے میں، تڑپتا دیکھنے میں، ذلیل و رسوا کرنے میں تفریح حاصل ہوتی ہے، لیکن کیا کوئی مہذب قانون محض اس لئے اس "تفریح" کو جائز قرار دے سکتا ہے کہ "تفریح" انسان کا پیدائشی حق ہے؟

ثابت ہوا کہ تمام دوسری خواہشات کی طرح خواہش "تفریح" کو بھی بعض اصول وضوابط کی ڈور میں جکڑنا معقولیت اور تہذیب کے لازمی تقاضوں میں سے ہے۔ "تفریح" کسے کہتے ہیں یہ بھی یہیں طے کرنا ہوگا۔ شکمی بھوک اور جنسی بھوک دونوں فطری جذبے ہیں لیکن ان کو کسی تعریف کی احتیاج نہیں۔ مگر "تفریح" یقینی طور پر ایک واضح تعریف کی محتاج ہے۔ کسی شخص یا جماعت کا یہ کہہ دینا کہ گانا بجانا یا ناچ رنگ یا تاش شطرنج ہماری تفریح ہے تفریح کی تعریف متعین نہیں کرتا بلکہ محض شخصی رجحانات کا اظہار کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی بجائے خود تفریح نہیں بلکہ اسے تفریح کے زمرے میں رکھنا یا خارج کردینا ہر شخص کے ذاتی میلان اور ذوق پر منحصر ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ زید اپنا تمام فارغ وقت مطالعہ میں صرف کردیتا ہے کیونکہ مطالعہ سے بڑھ کر تفریح اسے کسی شغل میں نہیں آتی مگر طلحہ بہتر سے بہتر کتاب اور رسالے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا کیونکہ اسے مطالعے سے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ شطرنج اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ تیسرا شخص نہ مطالعے سے دلچسپی رکھتا ہے نہ شطرنج سے۔ اسے تو تاش اور چوسر کی دھن ہے۔ چوتھا آدمی ان میں سے کسی بھی شغل میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا بلکہ بٹیر بازی میں مگن ہے۔ پانچواں آدمی ریڈیو پر کرکٹ میچ کی کامنٹری سننے کو دنیا کی افضل ترین تفریح تصور کرتا ہے اور اس حد تک اس کی لذت میں گم ہے کہ کسی پنواڑی کے ریڈیو پر کئی گھنٹے کھڑے رہنے میں بھی اسے ذرہ برابر کوفت نہیں ہوتی۔ چھٹا آدمی فلسفے یا ریاضی یا علم المعاش کی پیچیدہ اور خشک ترین گتھیاں سلجھانے میں منہمک ہے اور اس "تفریح" میں اسے کھانے پینے تک کا ہوش نہیں۔

تو ہمیں تفریحات کی اضافی اور اعتباری اقسام پر دماغ سوزی کرنے کے عوض نفس "تفریح" کی ایک تعریف متعین کرنی ہوگی تاکہ گفتگو بالکل واضح رخ اختیار کرسکے۔

تفریح سیدھے سادے لفظوں میں "غیر معمولی دلچسپی" کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایک ایسی کیفیت جس سے ہمارا نفس لذت اور انبساط محسوس کرے "نفس" کے لفظ پر اگر نئے ذہن کو اعتراض ہو تو ہم اس کی جگہ "دل و دماغ" بول سکتے ہیں۔ لفظ "وجدان" بھی کسی درجے میں "نفس" کی جگہ لے سکتا ہے۔ بہرحال تفریح ایک کیفیت ہی کا نام ہے جسے ہم داخلی طور پر محسوس کرتے ہیں اور اسی احساس کو لذت، دلچسپی اور کیف و انبساط جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تفریح کا مرادف انگریزی لفظ RECREATION اگرچہ بادی النظر میں قدرے جدا مفہوم کا حامل ہے لیکن حقیقۃً کوئی فرق نہیں۔ مذکورہ کیفیت جسم کے اندر ایک کیمیاوی عمل پیدا کرتی ہے جس کے اثر سے اعضاء و جوارح کی تھکاوٹ دور ہوتی ہے اور وہ انرجی واپس آتی ہے جو جسمانی یا ذہنی محنت کے سلسلے میں صرف ہوئی ہے۔ اسی کی نشاندہی انگریزی اصطلاح سے ہوتی ہے۔

بات ہر حال میں یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسا شغل اختیار کرنا جو فرائض منصبی کی ادائگی کے بعد دل و دماغ کو سکون و انبساط کا احساس دے سکے انسانی طبیعت کا ایک قابل لحاظ تقاضا ہے اور اسلام چونکہ کسی بھی طبعی تقاضے کو بالکلیہ مسترد نہیں کرتا اس لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ تفریحات کا خانہ بالکل بند کردے لیکن اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اس باب میں انسان کو لامحدود آزادی عطا کردے اور کسی طرح کی شرط و قید اس پر عائد نہ کرے۔ جنس و شکم کی قوی ترین اور ناگزیر جبلتوں پر بھی اگر اس نے نکاح اور اکل حلال کی پابندیاں عائد کی ہیں تو تفریح پسندی کا داعیہ تو بہرحال ان جبلتوں سے ہلکا اور دبا ہوا ہے اس کو بے قید کیسے چھوڑ دیگا۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کس نوع کی پابندیاں لگاتا ہے اور کن اصول و نظریات پر اس کی اجازت و ممانعت کا انحصار ہے۔

کوئی بھی سنجیدہ آدمی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔ کہ ہر مذہب اور ہر ازم کے پیش نظر کچھ اصول و مقاصد ضرور ہوا کرتے ہیں جنھیں وہ بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اشتراکیت، سوشلزم، کمیونزم،

کوئی بھی تصورِ حیات افراد اور معاشرے کو اپنے خاص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتا ہے اور اپنے تمام قوانین اسی عزم کے تحت اس طرح وضع کرتا ہے کہ مطلوبہ سانچہ لازماً بن کر رہے اور ہر وہ رکاوٹ دور ہوتی چلی جائے جو اس سانچے کی تکمیل میں حائل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ افراد کا کونسا فعل و عمل کس درجے کا جرم ہے یا کس فعل و عمل کو کس درجہ لائقِ تعریف قرار دیا جانا چاہئے اس کا بھی مدار ہر ازم میں اسی چیز پر ہوا کرتا ہے کہ اس فعل و عمل سے بنیادی مقاصد کو کتنا فائدہ یا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ قدروں کا تعین اور معیاروں کی تشکیل بھی اسی روشنی میں ہوتی ہے۔ اس کا صاف اور غیر مبہم مطلب یہ ہے کہ کسی بھی خاص ازم کا نقطۂ نظر اگر ہم کسی فعل و عمل کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو صحیح اور معقول طریقہ یہ ہوگا کہ اسی ازم کے بنیادی مقاصد اور مطلوبات تک رسائی حاصل کریں۔ یہ نہیں ہوگا کہ بنیادی مقاصد تو لیں ہم کسی دوسرے ازم سے اور پھر ان کی روشنی میں مذکورہ فعل و عمل کی حیثیت متعین کریں۔

اس کی موٹی سی مثال یوں سمجھئے کہ کمیونزم ریاست کی ساری دولت کو ایک مرکز پر جمع کر کے افراد میں اس کی منصفانہ تقسیم کو بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے۔ اب اگر اس فعل و عمل پر گفتگو شروع ہو کہ بینکوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لینا کمیونسٹ حکومت کے لئے جائز ہے یا نہیں تو فیصلہ دینے سے قبل آپ کو طے کرنا ہوگا کہ فیصلے کا مدار کمیونزم کے زاویۂ نظر پر رکھیں گے یا سرمایہ دارانہ نظام کے۔ اگر اول الذکر کا انتخاب فرمائیں گے تو لازماً یہی فیصلہ دینا ہوگا کہ یہ اقدام جائز و درست ہے اور اگر ثانی الذکر کو منتخب کریں گے تو یہی فعل انسانی حقوق کے خلاف غاصبانہ جسارت قرار پائے گا۔

ٹھیک اسی طرح اسلام بھی ایک ازم ہے۔ ایک مفصل نظام اور مبسوط تصورِ حیات ہے۔ اس کے اپنے مقاصد اور نشانے ہیں۔ اپنی قدریں اور معیار ہیں۔ آپ کو یہ اختیار تو ضرور ہے کہ اس ازم سے اپنا ذہنی رشتہ کاٹ لیں۔ اسے رد کر دیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ ہم تو کمیونزم یا سرمایہ دارانہ تصورِ حیات یا عیسائیت یا نازی ازم کے قائل اور پیرو ہیں۔ لیکن یہ اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنا امام، اپنا راہنما، اپنا پسندیدہ ازم قرار دینے کے بعد بھی کسی فعل و عمل کی حیثیت کسی دوسرے ازم کے اصول و مقاصد اور اقدار و معیار کی روشنی میں متعین کریں۔ جب بھی آپ یہ فیصلہ کرنا چاہیں گے کہ فلاں معاملے میں اسلام کیا حکم دیتا ہے تو آپ کو اپنا ذہن ہر دوسرے ازم اور تصورِ زندگی سے پھیر کر صرف اسلام کی طرف موڑنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ اسلام فرد اور معاشرے کو جس رنگ میں رنگنا چاہتا ہے اس پر اس فعل و عمل کے موافق یا مخالف اثرات کیا پڑتے ہیں۔

بڑی خرابی ۔ بلکہ اصل خرابی آج یہی ہے کہ مروجہ اسکول کالجوں کے طلباء و اساتذہ جب اپنے کسی محبوب و مرغوب شغل اور اپنی کسی رائے کے خلاف حرمت کا فیصلہ سنتے ہیں تو اس فیصلے کی صحت و صداقت کا ادراک کرنے کے لئے وہ اسلامی اصول و مقاصد کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ اس عقل کو کسوٹی بناتے ہیں جس کے نوک پلک مادہ پرستانہ تصوراتِ حیات نے درست کئے ہیں اور ان معیاروں کو پیمانہ بناتے ہیں جن کی تشکیل اسلامی اصول و مقاصد کے کارخانے میں نہیں ہوئی بلکہ وہ مادیت کی کارگہِ فکر میں ڈھالے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ سرمایہ دارانہ نظام کے کسی قانونی فیصلے کو اشتراکیت کی کسوٹی پر پرکھیں گے یا جمہوری دستور کی کسی دفعہ کو آمریت کے پیمانے سے ناپیں گے تو وہ دفعہ اور وہ فیصلہ غلط ہی نظر آئے گا۔ اسلام کی پیروی کا جو شخص دعویٰ کرتا ہے اور شریعتِ اسلامیہ کو اپنا راہنما ماننے کا مدعی ہے اس کے لئے معقولیت اور دیانت کی صرف یہی ایک راہ ہو سکتی ہے کہ جن اصول و مقاصد اور اقدار و معیار کو خود اسلام نے جس درجے میں رکھا ہے وہ بھی انہیں اسی درجے میں رکھے اور اپنی ذاتی پسند یا عقلی گدّے بازی یا اسلام کے سوا کسی اور تصورِ حیات کے عطا کردہ معیاروں کو بیچ میں نہ لائے۔ اگر وہ سنجیدگی اور ہوشمندی کے ساتھ ایسا کرے گا تو پھر اس کی زبان سے شرعی فیصلوں کے سلسلے میں "بوریت" اور "خشکی" جیسے سطحی اور عامیانہ طعنے کبھی سنے نہیں جائیں گے۔

اب ہمیں یہ یاد دلانا ہے کہ اسلام اور غیر اسلام میں بنیادی اصول و مقاصد کا کتنا عظیم فرق ہے اور یہ دونوں ازم ۔۔۔ یعنی

اسلام اور کفر اپنے فکری سفر کے آغاز ہی میں کس طرح ایک دوسرے کی مخالف سمت چلتے ہیں۔

اسلام انسان کا مقصدِ حیات اپنے پیدا کرنے والے معبود کی کامل اطاعت قرار دیتا ہے اور دنیا کی قلیل سی زندگی کو آخرت کی لامحدود زندگی کے لئے امتحان اور آزمائش کے درجے میں رکھتا ہے۔

اس کے برخلاف آج کے تمام ہی غالب و نافذ اقوام اس تصور پر متفق ہیں کہ یہی دنیا سب کچھ ہے اور اسی دنیا میں انسان کو زیادہ سے زیادہ لذت و راحت کی جستجو کرنی چاہیئے۔ ان کے یہاں مرنے کے بعد کی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں اور اگر ہے تو محض رسمی اور روایتی۔ نہ اس میں کوئی جان ہے نہ اس کے لئے کوئی بنیاد ان کی دنیائے فکر و خیال میں موجود ہے عیسائیت بے شک حیات بعد الموت کے تصور بلکہ عقیدے سے خالی نہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ آج کے مقبول و مقتدر تصورِ حیات اور فلسفۂ زندگی کا نام عیسائیت نہیں ہے۔ عیسائیت تو نظری حیثیت سے بھی کسی جامع اور ہمہ گیر نظامِ زندگی کا تصور پیش نہیں کرتی۔ پھر جس محدود حد تک وہ روحانیت کا ایک خاکہ پیش کرتی ہے وہ بھی آج کے مقتدر تصورِ حیات کے دائرے سے خارج ہو کر چرچ کے کونے میں پڑا ہے۔

حاصل یہ کہ اجتماعی زندگی اور انفرادی حقوق و فرائض کے بارے میں چاہے عیسائیوں کے اختیار کردہ تصورِ حیات کو لو یا ملحدوں اور دہریوں کے تصورِ حیات کو۔ ہر ایک اپنے فکر و نظر کی جولانگاہ فقط اسی دنیا اور اسی زندگی کو قرار دے چکا ہے اور کسی بھی ضابطے اور قانون کی وضع میں اُخروی زندگی کے تصور کا شمہ برابر دخل نہیں ہے۔

پھر بھلا اس بنیادی فرق کی موجودگی میں اسلام اور غیر اسلام کے تصورِ اخلاق اور اقدار و معیار میں عظیم فرق کیوں نہ واقع ہوتا۔ اسلام نے جن چیزوں کو جرم و گناہ قرار دیا ان میں سے کتنی ہی چیزیں دوسرے ازموں کی نظر میں عین تہذیب بن گئیں۔ اسلام نے جسے جاہلیت قرار دیا۔ دوسرے ازموں نے بسا اوقات اسے عینِ علم اور عین ترقی ٹھیرایا۔ اسلام نے اخلاقِ ذمیمہ اور اخلاقِ حسنہ کی ایک مستقل اور دائمی حد بندی کی لیکن دوسرے ازموں نے اپنے اپنے بنیادی اصول و مقاصد کے اعتبار سے اخلاق کو محض ایک اضافی شے کی حیثیت بخشی اور فرد کے حقوق کی ایسی فہرست بنائی کہ زنا جیسی قبیح شے کے محرکات و وسائل تو محاسن کی صف میں آ گئے اور خود زنا بھی شاذ ہی صورتوں میں جرم ٹھیرا ورنہ اس کی تقریباً نوے فیصد صورتیں قانون کی گرفت سے باہر قرار پا گئیں۔

یہ کوئی طنز نہیں ہے۔ وعظ بھی نہیں ہے مسلّمہ حقائق ہیں جنھیں ہم جیسے ہزاروں نے زبان و قلم سے بار بار دہرایا ہے آپ خوب جانتے ہیں کہ اسلام میں عفت و عصمت کی کیا اہمیت ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جدید ترین تصورِ حیات میں عفّت و عصمت کی اہمیت کو بالکلیہ ختم کرنے کی کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی گئی ہے۔ یہ تو مذہب ہی کا کیا دھرا اثر ہے کہ ابھی تک آزاد جنسی تعلق کو کھلم کھلا مباح و مستحسن قرار دینے والے عام نہیں ہوئے۔ لیکن زنا کو آسان سے آسان تر اور شہوانی ہیجان کو زیادہ سے زیادہ اُبھارنے والے طرزِ زندگی کو پوری لگن اور شد و مد سے رائج و مقبول کرنا جس تصورِ زندگی کا محبوب مشغلہ ہو کیا اس میں حقیقۃً بھی آزاد جنسی تعلق کیلئے اکراہ و نفرت کا کوئی جاندار جذبہ موجود ہو سکتا ہے؟۔۔۔ اگر یہ اہی اور سیاہی میں تضاد ہے، اگر گرمی اور سردی ایک دوسرے کی ضد ہیں تو پھر یہ دو باتیں بھی ایک دوسرے کی نقیض ہی کہلائیں گی کہ ایک شخص عفت و عصمت کو قیمتی بھی سمجھے اور اسپر عام دست درازیوں کے ظاہری و معنوی وسائل بھی بڑے شوق سے فراہم کرتا جائے۔

محض ایک جنسی تعلق ہی تک بات نہیں۔ اسلام اور غیر اسلام اس دنیا اور اس کے بسنے والوں کی جو حیثیتیں متعین کرتے ہیں ان کا فطری تقاضہ یہی ہونا چاہیئے اور یہی ہو رہا ہے کہ ان کے معیاروں اور قدروں میں قدم قدم پہ ٹکراؤ ہو۔ شراب، سود، قمار، کونسی بُرائی ہے جس کے بارے میں ان دونوں کا نقطۂ نظر اور فیصلہ یکساں ہو اور عبادت، ضبطِ نفس، خدا ترسی کونسی بھلائی ہے جسے دونوں یکساں اہمیت دیتے ہوں

حد ہے کہ نماز اسلام کی نظر میں ایک ایسی عبادت ہے جسے سفر، حضر، صحت و مرض حتیٰ کہ جہاد تک میں نہایت ضروری اور ناگزیر قرار دیا گیا اور ہر مسلمان پر پانچ وقت یہ اس طرح لازم کردی گئی جیسے زندگی کے لئے رزق اور تن پوشی کے لئے لباس، لیکن غیر اسلامی طرز حیات اور انداز نظر سے متاثر ہونے کے بعد آپ کے سامنے ہے کہ اس فریضے کی ادائیگی کا مسلمانوں میں کیا تناسب ہے۔ یہی کالج کے نونہال اور پروفیسر جو تھیٹر، سینما اور ناچ رنگ کو فطری رجحان اور تفریح کے نام پر جائز باور کرانا چاہتے ہیں کیا نماز روزے تک کو "بوریت" نہیں سمجھتے؟۔

منھ سے شاید ابھی یہ نہ کہہ سکیں لیکن ان کے لیل و نہار کا مطالعہ فرمالیجئے زبانِ حال آپ کو صاف صاف بتلادے گی کہ نماز روزے کی کوئی اہمیت ان کے ذہن میں نہیں بلکہ اس کے مقابل دنیا کے معمولی معمولی فرائض حتیٰ کہ تفریحی مشاغل بھی زیادہ ضروری اور اہم ہیں۔ ہونے بھی چاہئیں۔ یہ جس طرح کی تعلیم حاصل کررہے ہیں اس کی تشکیل ہی اس مقصد کے پیش نظر ہوئی ہے کہ انسان دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے وہاں زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کرنے کی راہ نکالے اور اس تعلیم نے جو ماحول پیدا کیا ہے اس میں لازماً ایسے ہر شغل سے بیزاری اور ذہنی بے تعلقی ہونی ہی چاہئے جو فقط معادِ آخرت اور رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیا جاتا ہو۔

جیسا کہ ابھی ہم کہہ آئے ہیں یہ بیچارے تو تنکے ہیں جو مغربی تصورِ حیات کے سرچشمے سے پھوٹنے والے سیلِ بیکراں میں بہے چلے جارہے ہیں۔ انھیں لذت چاہئے۔ خواہشات کی آسودگی چاہئے من مانی تفریح چاہئے۔ یہ پانی کے تیز و تند بہاؤ کی مخالف سمت میں کیسے چل سکتے ہیں۔ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ہم جن مشاغل کو تفریح کے معصوم نام سے اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اسلام کے بنیادی مقاصد او مطلوبہ نقشے پر کس نوع کا اور کتنا اثر ڈالتے ہیں۔

بات خاصی پھیل گئی مگر مسئلے کی تفہیم کی خاطر اس کا پھیلنا ضروری بھی تھا۔ اب ہم اس پہلو پر اظہار خیال کریں گے کہ اسلام نفس تفریح کا مخالف نہیں ہے بلکہ تفریحات کی صرف اُن قسموں کا مخالف ہے جو اس کے اخلاقی تصورات سے متصادم ہوں یا جن کی وجہ سے اس کے جائز کردہ فرائض منصبی کی ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہو۔ انصاف کیجئے کیا یہ چاہنا کچھ بے جا ہے؟ کیا دنیا کا ہر آئین و دستور اور ہر ناظم انسان سے یہی مطالبہ نہیں کرتا؟

آپ جس دفتر یا فیکٹری میں ملازم ہیں کیا اس کا سربراہ یہ پسند کرے گا کہ ڈیوٹی کے اوقات میں آپ کوئی ایسا شغل اختیار فرمائیں جس سے متعلقہ کام کو نقصان پہنچے یا جس سے وہاں کے ڈسپلن اور ضوابط کی دھجیاں اُڑیں گے؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں! ــــ پھر یہ کیسے تصور میں آسکتا ہے کہ جس خدا نے انسان کو کچھ فرائض تفویض کئے ہیں اور فرد و اجتماع دونوں کے لئے کچھ ضابطے معین فرمائے ہیں وہ یہ پسند کرے کہ انسان ایسی تفریحات میں مشغول ہوجائے جو ان فرائض اور ان ضابطوں کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوں۔ دفتر یا فیکٹری میں آپ ایک جزئی وقت کے لئے ملازم ہیں اس لئے اس وقت میں اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد آپ کے سر سے پابندی اٹھ جاتی ہے اور آپ آزاد ہوتے ہیں کہ باقی وقت میں جو چاہے کرتے پھریں لیکن اسلام کا یہ معاملہ نہیں، اسلام تو آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ پر حاوی ہے اور حاوی کیسے نہ ہو جب کہ خدا کی آقائی کا جُوا آپ کی گردن سے ایک پل کے لئے بھی اُترنا ممکن نہیں ہے اور کوئی ساعت ایسی نہیں آسکتی جب آپ اس کی نعمتوں سے فائدہ نہ اُٹھا رہے ہوں۔ پھر یہ کیسے معقول ہوسکتا ہے کہ زندگی کی کسی بھی ساعت میں آپ کو اسلامی اقدار و اصول اور مقاصد و اغراض کو نقصان پہنچانے والی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے۔ آپ تفریح کے نام پر قانون شکنی نہیں کرسکتے نہ آپ کے غیر صحت مند رجحانات کی خاطر اسلام اپنے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کرسکتا ہے۔

اب غور یہ کرنا چاہئے کہ آج ہمارے معاشرے میں جن افعال و اعمال کو عین تفریح تصور کرلیا گیا ہے کیا وہ ایک مسلمان کیلئے حقیقۃً "تفریح" قرار پاسکتے ہیں یا ان کے تفریح قرار پانے کا باعث ہمارے ذہن و مزاج اور مذاق و میلان کا کوئی بگاڑ ہے۔ یہ حقیقت ہماری پیش کردہ مثالوں سے ابھی آپ پر واضح ہوچکی کہ کوئی بھی شغل لازمی طور پر "تفریح" نہیں کہلا سکتا بلکہ اس کی تفریحی حیثیت کا انحصار افراد کے مذاق و میلان پر ہوا کرتا ہے۔ کبوتر باز سے پوچھئے وہ کبوتر

بازی کو بہترین تفریح ٹھیرائے گا لیکن ایک ناچ رنگ کے رسیا کو اسی تفریح میں شرکت کی دعوت دیجئے تو وہ اس کے سانئے تک سے بیزاری کا اظہار کرے گا۔ اسی طرح ایک شخص نجوم وہیئت کی کتابیں پڑھنے کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ بتائے گا لیکن دوسرے شخص کی نظر میں اس "تفریح" کی حیثیت مراق اور بوریت کے علاوہ کچھ نہ ہوگی۔

تو معلوم ہوا کہ کسی بھی شغل کو "تفریح" ماننا یا نہ ماننا افراد کے ذہنی رجحان اور پسند پر معلق ہے۔ آج اگر ناچ رنگ، گانا بجانا، سینما تھیٹر اور مرد وزن کی مخلوط محفلیں نئی نسل کے لئے مسلّم تفریحات کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ سب ہی طرح کے ذہن ومزاج کو فرحت وانبساط بخشنے کی فطری صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ان کا تفریح قرار پانا تو در اصل ہماری اس ذہنی ساخت کا اثر ہے جسے مروجہ تعلیم وتربیت، مسموم ماحول اور خدا بیزار فلسفۂ زندگی نے تشکیل دیا ہے۔ ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہاں دنیا پرستانہ تصورِ حیات کی عملداری ہے اور وہ ہمارے ذہنوں کو ایک خاص رخ پر چلا رہا ہے۔ ہمیں خوب وناخوب کے معیار بھی اسی سے مل رہے ہیں اور ہر طرح کی قدریں بھی وہی مہیا کر رہا ہے۔ کل جب یہ تصورِ حیات اتنا حاوی نہیں تھا تو ہمارے ذہنی لگاؤ نے کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، چوسر، گنجفہ اور گلی ڈنڈا جیسی خرافات کو "تفریحات" کی محراب پر سجایا تھا مگر آج یہ تصورِ حیات اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ جتنا جتنا پھیلتا جا رہا ہے اتنی ہی اتنی ان قدیمی "تفریحات" کی تفریحی حیثیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور ان کی جگہ وہ مشاغل اور سرگرمیاں "تفریح" بنتی جا رہی ہیں جن کا مزاج اس تصورِ حیات کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ جو تصورِ حیات فقط اسی دنیا کی لذّت وراحت کو تمام تر اہمیت دے گا اور آخرت کی جواب دہی سے اس کا فکری رشتہ بالکل کٹ جائے گا اسے لازماً وہی چیزیں زیادہ پرکشش ہوں گی جن میں کام ودہن کیلئے زیادہ سے زیادہ لذت کا سرمایہ موجود ہو۔ پھر کیا کوئی بھی ہوش مند اس آفاقی حقیقت سے بے خبر ہے کہ دنیا میں بھوک کی آسودگی سے بڑی جسمانی لذّت کوئی نہیں چاہے یہ بھوک پیٹ کی ہو یا پیٹھ کی۔ لہٰذا اس تصورِ حیات کے عین مزاج ہی میں اس لذّت کو بنیادی اور محوری اہمیت حاصل ہونی ہی چاہئیے۔ چنانچہ وہ ہے اور ڈنکے کی چوٹ ہے۔ جن ممالک کو اس تصورِ حیات کا مرکز، مامن اور مصدر ومنبع ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں ہر آنکھ والے کو نظر آ رہا ہے کہ انسان شہوات کی سیرابی کے سلسلے میں قرنوں پہلے کے وحشی اور غیر مہذب انسان کی سطح سے بھی نیچے پہنچ چکا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ پہلا وحشی انسان سیاہ کو سفید کہنے کا فن نہیں جانتا تھا مگر آج کا مہذب انسان اندھیرے کو اجالا ثابت کرنے میں اس حد تک طاق ہو چکا ہے کہ وہ عین بازار میں مادر زاد برہنہ ہو کر بھی بڑے شاندار الفاظ میں اپنے حیادار اور مہذب ہونے کا یقین دلائے گا۔

بہرحال "عورت" جب اس تصورِ حیات کی ایک مرکزی چیز ٹھیری ―― اور اسے ٹھیرنا ہی چاہئیے تھا تو پھر قدرتی بات ہے کہ اس تصورِ حیات کو قلب وذہن میں رچانے والے ہر اس مشغلے اور سرگرمی کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور محسوس کریں گے جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے "عورت" موجود ہو۔ انھیں کبوتروں اور بٹیروں سے کیا دلچسپی ہوگی۔ انھیں تو کسی ایسے کھیل میں بھی مزا نہیں آ سکتا جس میں فقط مرد ہی مرد ہوں۔ سینما، تھیٹر، ورائٹی شو، ناچ رنگ، ان سب میں سے "عورت" کو نکال دیجئے پھر دیکھئے یہی "ثقافت وکلچر" کے متوالے انکی بوریت پر سر پیٹ لیں گے اور ان خرافات کی طرف رُخ بھی نہیں کریں گے۔ کیونکہ عورت کی شمولیت کے بغیر ان مشاغل کا مزاج اُس تصورِ حیات کے مزاج سے جوڑ نہیں کھائے گا جس میں جنسی لذّت کو بے تحاشا اہمیت حاصل ہے۔

قوالی بھی گانے بجانے ہی کی ایک قسم ہے۔ جس وقت معاشرے پر اس تصورِ حیات کا خاصا تسلّط نہیں تھا اور مرد کے اعصاب پر "عورت" اس بُری طرح سوار نہیں ہو سکی تھی اس وقت یہ تفریح بڑے عروج پر تھی۔ آج بھی جن جہلاء کو نئی تعلیم اور نئے ماحول سے کافی فیض نہیں ملا وہ قوالی بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ لیکن جو خاصی حد تک فیض یافتہ ہوگئے

انھیں آپ قوالی سے بیزار ہی پائیں گے اور نہیں دیکھیں گے کہ اسے بھی انھوں نے اپنی تفریحات کی فہرست میں باقی رکھ چھوڑا ہو۔

ہاں مسلم سازوں نے اس نکتہ کو خوب سمجھا کہ نئی پود در اصل قوالی سے بیزار نہیں ہے بلکہ اس بات سے بیزار ہے کہ قوال عموماً مرد ہی ہوتے ہیں۔ پھر تو فلموں میں عورت کو بھی "قوالن" بنایا گیا اور کسی بھی سنیما دیکھنے والے نوجوان سے پوچھ دیکھئے وہ ایسی قوالی سے عموماً "بور" نہیں ہوگا جس میں کوئی کلچرڈ قسم کی عورت بھی "تان" اڑا رہی ہو۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ سے بھی تو نئی نسل کو زبردست دلچسپی ہے حالانکہ انکا "جنسیت" سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم جواب دیں گے کہ جنسیت کو اس تصورِ حیات میں مرکزی اہمیت حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بس اسی ایک دائرے میں اس کے اثرات محدود ہو کر رہ گئے۔ یہ اثرات تو گوناگوں ہیں اور زندگی کے تمام ہی گوشوں اور دائروں میں ان کے سائے دامن پھیلائے ہوئے ہیں۔ رہن سہن کے طریق، مسائل پر غور کرنے کے زاویے، دولت کمانے کے طریقے، پسند اور ناپسند کے معیار، سماجی رسوم اور اخلاقی آداب کونسی چیز ہے جس پر ان اثرات کی چھاپ نہیں — کرکٹ، ہاکی، تاش، بیڈ منٹن یہ سب کھیل اسی تصورِ حیات کے مصدر و مخزن — مغرب سے آئے تھے۔ خالص مشرقی تفریحات سے کٹ کر ان کی طرف مائل ہونے کی وجہ یہ نہیں ہوئی کہ ان میں تفریح کا عنصر مقابلتاً کچھ زیادہ تھا بلکہ یہ ہوئی کہ ان پر مغرب کی مہرِ پسندیدگی ثبت تھی۔ یہ مغرب سے مربوط ہونے کے باعث تہذیب و ترقی کی علامت مان لئے گئے اور ان کے مقابلہ پر پرانی "مشرقی تفریحات" شرمناک محسوس کی جانے لگیں۔

ذرا غور کیجئے۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ اگر کہیں گلی ڈنڈا کھیلتے نظر آجائیں تو "مہذب" نسل اسے کتنا مضحکہ خیز اور غیر سنجیدہ قرار دے گی۔ لیکن یہی لوگ اگر کرکٹ کھیلتے پائے جائیں تو ایسا کوئی الزام ان کے وقار پر نہیں آئے گا — کیوں؟ کیا دونوں کھیلوں میں کوئی جوہری فرق ہے؟ کیا ذہنی معیار اور زاویۂ نگاہ کے علاوہ بھی کوئی ایسی دلیل موجود ہے جو ان میں سے ایک کو غیر متین اور دوسرے کو متین ثابت کرے یا ایک کو مضحکہ انگیز اور دوسرے کو قابلِ فخر ٹھیرا سکے؟

"تفریح" کی اضافی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی کیجئے کہ ابھی کچھ دنوں پہلے تک کرکٹ کو یہ مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ خاصا رواج ہاکی اور فٹ بال کا تھا۔ لیکن اب یہ کھیل پس منظر میں جا پڑے اور کرکٹ اس طرح دماغوں پر سوار ہو گیا کہ اس کی مقبولیت اور کشش جنون کی حدوں کو چھونے لگی۔ یہ بہت ہی واضح دلیل ہے اس حقیقت کی کہ کسی فعل و شغل کا تفریحی درجہ خود ہمارا ذہنی میلان معین کرتا ہے اور ذہنی میلان کی تشکیل اور نشوونما پر خارجی محرکات بڑی شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ کرکٹ زیرِ بحث تصورِ حیات کے اعتبار سے بڑی شاندار تفریح ہے کیونکہ ہاکی اور فٹ بال جیسے کھیلوں کے مقابلے میں اس میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ لیکن اسلامی زاویۂ نظر کو استعمال کیجئے تو معاملہ الٹ جائیگا۔ یہ زاویۂ نظر کسی بھی ایسے کھیل کو پسندیدہ قرار نہیں دے سکتا جو روزانہ کے سب سے بڑے رکن — نماز کی ادائیگی میں حائل ہو جائے۔

●

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جن مشاغل کو آج عین تفریح سمجھ لیا گیا ہے اور ان کے بغیر زندگی سراپا بوریت متصور ہوتی ہے وہ فی الاصل عینِ تفریح نہیں ہیں بلکہ انھیں "تفریح" کا نام ہمارے ان ذہنوں نے دیا ہے جو ایک خاص رُخ پر نشوونما پا رہے ہیں۔ یہی ذہن اگر کسی اور رُخ پر نشوونما پاتے تو "تفریح" کے خانے میں ہمیں کچھ اور چیزیں نظر آتیں۔ آپ سوال کرتے ہیں کہ اگر کلچرل تفریحات اسلام میں ممنوع ہیں تو ان کا متبادل اسلام کیا پیش کرتا ہے — یہ سوال ہی اس بات کا گواہ ہے کہ خود آپ کا ذہن بھی دھوئیں سے خالی نہیں ہے۔ متبادل اُن چیزوں کا ڈھونڈا جاتا ہے جو بجائے خود ضروری اور مثالی ہوں۔ یہ تفریحات نہ ضروری ہیں نہ مثالی۔ انھیں تو ذہنی فساد نے جنم دیا ہے۔ اگر ذہنوں کو شروع ہی سے اسلامی اخلاق کے رُخ پر نشوونما ملے اور اسلامی معیارِ اخلاق ہی طبیعت میں رچ بس جائے تو

کیسے ممکن ہے کہ وجدان کسی بھی ایسے شغل میں فرحت و انبساط محسوس کر سکے جس کے خاکے میں اسلامی اخلاق کے لہو سے رنگ بھرا گیا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہی ناچ رنگ جس پر ہماری طبیعت عام حالات میں خوانِ یغما کی طرح ٹوٹی پڑتی ہے ایسے عالم میں ذرا بھی دل کو نہیں بھاتا۔ بلکہ تکلیف دہ بن جاتا ہے جب ہمارا جوان بیٹا نزع کی کیفیت میں مبتلا ہو یا ہمیں دفعتاً کسی بہت بڑے نقصان کی اطلاع ملی ہو۔ صدمے اور غم کی شدید کیفیات محسوسات کا رُخ بدل دیتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح دل و دماغ میں پیوستہ عقائد بھی محسوسات کو اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں اور ماحول بھی اگر ان عقائد سے ہم آہنگ ہو تو پھر کوئی معمولی سی چیز بھی — جو ان عقائد سے مطابقت نہ رکھتی ہو بری طرح کھلتی ہے۔

جوان لڑکیوں کا چست اور جذبات انگیز ملبوسات میں ناچنا، اسٹیج پر اداکاری کرنا، مردوں کے دوش بدوش ہر طرح کی سرگرمیوں میں حصّہ لینا۔ یہ تو بہت بعد کے مراحل ہیں۔ اسلامی تصورِ حیات کے رنگ میں رچا ہوا ذہن تو جنسی انارکی کی اس تمہید کو بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ عورتیں بن ٹھن کر سڑک پر نکلیں اور مرد کی جنسی جبلّت ہیجان کی زد میں آئے۔ اس تمہید کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے اور یہی ہوا بھی ہے کہ جنسیت کی زمین میں فساد کی تخم ریزی ہوئی اور پھر برگ و بار نے سر اُٹھایا، کونپلیں پھوٹیں اور پھل پھول پیدا ہوئے۔

زنا کے لذیذ ہونے میں کسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ شراب کے سرور میں کیا شک کی گنجائش ہے۔ لیکن اسلام نے ان لذائذ کی جو حیثیت مشخص کی ہے اسے اگر ہمارے ذہن و قلب سچ مچ قبول کر لیں تو پھر ہمارے وجدان کے لئے ان لذائذ میں تفریح اور انبساط کا کوئی عنصر باقی نہیں رہے گا بلکہ ان سے ہمیں گھن آئے گی۔ گھٹن ہوگی، بیزاری محسوس کریں گے۔ یہی وہ نفسیاتی نکتہ ہے جس کی بنا پر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تفریحات کا مخالف نہیں بلکہ ہمنوا ہے مگر وہ دل و دماغ کو ایسے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے کہ جو مشاغل اس کے معیارِ اخلاق سے ہٹے ہوئے ہوں ان میں آدمی کا وجدان لطف و لذت ہی محسوس نہ کرے بلکہ فقط ایسی ہی سرگرمیاں اسے لذیذ محسوس ہوں جن میں اسلامی اخلاق ملحوظ رکھا گیا ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کو یقین دلادیں کہ سامنے جو خوش رنگ حلوہ چاندی کے ورقوں میں لپٹا رکھا ہے اس میں غلاظت کی بھی آمیزش کی گئی ہے یا طشت میں سجے ہوئے گلاس کے شیریں مشروب میں پیشاب بھی خاصی مقدار میں ملایا گیا ہے تو اب اس کا وجدان آپ سے آپ استکراہ کی راہ اختیار کرے گا اور طبعی میلان پر روک لگ جائے گی۔

یہیں سے آپ اس لطیف حقیقت کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام تفریحات سے نہیں روکتا بلکہ بے خبری کا پردہ اُٹھا کر اذیت خوردگی کا سدّباب کرتا ہے۔ اسی مثال میں فرض کیجئے کہ حلوے کے غلاظت آلودہ ہونے کا آپ کو علم نہیں۔ آپ کے کام و دہن بیتاب ہیں کہ یہ منہ میں پہنچ جائے۔ اب اگر کوئی شخص آپ کو وجہ بتائے بغیر بالجبر اس کے کھانے سے روک دیتا ہے تو بلاشبہ آپ اُس کیفیت کا شکار ہوں گے جسے "بوریت" کہا جاتا ہے۔ آپ کو ذہنی اذیت بھی پہنچے گی۔ آپکو احساسِ محرومی بھی ہوگا لیکن یہی شخص اگر جبر کے عوض صرف یہ یقین دلادے کہ حلوے میں غلاظت ملی ہوئی ہے تو آپ خود بخود ہاتھ روک لیں گے اور آپ کے محسوسات وہ نہیں ہوں گے جو پہلی صورت میں تھے۔ نہ آپ کو محرومی کی اذیت پہنچے گی نہ وہ ذہنی گھٹن ہوگی جو کسی خواہش کے تشنہ رہ جانے پر طبعاً ہوا کرتی ہے بلکہ اُلٹا آپ خوش ہوں گے کہ بے خبری میں غلاظت نوش کرنے سے بچ گئے۔

یہی صورت زیرِ بحث مسئلہ میں بھی ہے۔ اسلام دلیل و برہان کے ساتھ یقین دلاتا ہے کہ شہوانیات کو ہوا دینے والے جن مشاغل کو تم نے تفریح سمجھ رکھا ہے ان میں نجاست و غلاظت کا شمول ہے۔ اب اگر ہم اسلام کی آواز پر کان دھرتے ہیں اور اس کی یقین دہانی ہمارے دل و دماغ میں اُتر جاتی ہے تو ان مشاغل سے رُک جانا کسی تفریح سے رُک جانا نہیں ہوگا بلکہ ترک کی کیفیت وہی ہوگی جو غلاظت آمیز حلوے سے رُک جانے کی تھی، اور بوریت یا محرومی کی اذیت محسوس کرنے کے عوض ہم ایک طرح کی مسرّت محسوس کریں گے کہ ایک غلیظ و

کھیل تماشے سے بچ گئے اور تھوڑی دیر کی لذت اندوزی کے عوض میں آخرت کا سخت عذاب ہمارے حصے میں آتا آتا رہ گیا۔

اس کے برخلاف اگر ہم اسلام کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور کسی اور ہی تصورِ حیات کے خطوط پر اپنے فکر و احساس کی گاڑی ہنکائے لئے جاتے ہیں تو پھر بے شک اسلام کا حکم اجتماعی عبودیت اور تفریح دشمنی ہی کا پیغام بر محسوس ہوگا۔ پھر اسلام کا نہیں بلکہ ہمارا دین اسلام بیزاری کا ہے جس کو جوانوں کی خوبی و ادا "ترقی یافتہ" سوسائٹی بڑی معیوب نہیں مانتے۔ یہ بہت بڑی تفریح سمجھتی ہے کہ سینما ہوں، وراثتی شو ہیں، اسٹیج کے ڈرامے ہوں، رقاصاؤں اور بیماباز ... میں دور ہی سے انھیں نسوانی چہروں اور مزین جسموں کا دیدار ہوتا ہے لیکن جو لوگ ترقی یافتہ "سوسائٹی" سے وابستہ ہیں اور عورت ان کے لئے سہل الحصول چیز ہو چکی ہے ان کے لئے محض دیدار میں کوئی قابلِ ذکر دلچسپی نہیں رہ جاتی بلکہ ان کی تفریح آگے کے مراحل سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ ان سے اگر کہو کہ بال روم میں اجنبی عورتوں کے ساتھ ناچنا اور آئے دن نت نئے رومان لڑانا، شراب پینا اور ریس کے گھوڑوں پر داؤ لگانا اسلام میں حرام ہے تو وہ بھی پلٹ کر یہی کہیں گے کہ پھر تو اسلام بڑا خشک ہے اور بور مذہب ہے وہ اس ترقی کے دور میں ہمیں تفریح کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

آخر بتائیے نا اگر درجۂ سفلی کی کلچرل سرگرمیوں اور ثقافتی مشغلوں سے روکنا بوریت ہے تو درجۂ اعلیٰ کے مشاغل و مرغوبات سے تعارض کرنا کیوں بوریت نہ ہوگا۔ یہ سب ایک ہی درخت کے تو برگ و بار اور پھل پھول ہیں۔ کون سی منطق ہے جس کی رو سے اس درخت کا پھلنا پھولنا معیوب قرار پائے جس کی جڑوں میں پانی دینے اور کھاد پہنچانے کو تفریحات کے زمرے میں شامل کر لیا گیا ہو۔ اسلام جس بنیاد پر ناچ رنگ اور مرد و زن کے اختلاط کو معیوب قرار دیتا ہے اگر وہ بنیاد کسی کی نظر میں لائقِ التفات نہیں ہے تو پھر ہم نہیں جانتے کہ زنا اور شراب اور کوئی بھی فعل و شغل اس کے نزدیک قبیح کس بنیاد پر قرار پائے گا۔ جذبات انگیز نسوانی پیکروں کو اگر ناچتے دیکھنا قباحت سے خالی ہے تو ان کے گداز جسموں کو ہاتھوں سے چھونا کیوں شنیع ہونے لگا اور اگر ہاتھوں سے چھونا مباح ہے تو ان سے جنسی تعلق قائم کرنے ہی میں حرمت و قباحت آخر کہاں سے آگئی۔

●

طولِ کلام کی معافی۔ ہم نے مسئلے کے منطقی گوشے آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اب حاصلِ کلام کے طور پر سنئے کہ اسلام تفریح کا دشمن نہیں ہے نہ لذت و راحت سے متنفر ہے۔ اس نے انسانی فطرت کے ہر تقاضے اور ہر مطالبے کی آسودگی کے لئے جائز طریقے مہیا کئے ہیں مگر وہ جسمانی مطالبات کے ساتھ روحانی مطالبات کو بھی گہری اہمیت دیتا ہے اور ان دونوں کا ایک خاص تناسب اس کو مطلوب ہے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جن اخلاقی آداب پر روح کی بالیدگی اور باطن کی طہارت کا مدار ہے انھیں جسمانی مطالبات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ نہ وہ یہ برداشت کر سکتا ہے کہ جو طور طریق اخلاقی رذالتوں کی سمت لے جانے والے ہیں انھیں تفریح کے نام پر جائز ٹھہرا لیا جائے۔ وہ انسان کو بلند مقصدِ زندگی دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی سرگرمیاں اس کے تابع ہوں۔

ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، بیڈمنٹن جیسے کھیل اس کی نظر میں بالذات کوئی قباحت نہیں رکھتے کیونکہ یہ اس کی کسی اخلاقی ہدایت سے متصادم نہیں ہیں لیکن یہ اگر ان فرائض و واجبات کو نقصان پہنچانے لگیں جنھیں اس نے انسان پر عائد کیا ہے تو پھر یہ قبیح قرار پائیں گے۔ نقصان کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انہیں کا کوئی کھیل مثلاً نماز کے کسی وقت پر حاوی ہو جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ دل و دماغ پر اس بری طرح طاری ہو جائیں کہ آدمی کا ذہنی رشتہ اعلیٰ مقاصد اور ان کے تقاضوں سے کٹ جائے بلکہ دور پڑ جائے۔ شطرنج کو بعض ائمہ نے اسی لئے حرام قرار دیا کہ اگرچہ بالذات کوئی برائی اس میں نہیں پائی جاتی لیکن وہ نماز جیسے اہم ترین فریضے تک سے غافل کرتی ہے اور دل و دماغ پر آسیب بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔

سینما، ناچ رنگ اور تمام ہی ایسی "تفریحات" جنھیں

مرد و زن کا اختلاط ہو بالذات ہی قبیح ہیں کیونکہ یہ سفلی جذبات کو مشتعل کرتی ہیں اور ہوس ان سے بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں اس نوع کی تفریحات سے کسی فوری ہیجان اور ہلچل کا احساس نہ ہوتا ہو لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے معاملے میں یہ چیزیں بالکل ہی بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ تدریجی طور پر اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ نفس پر ان کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں اور طبعی میلانات کو یہ اپنے سانچے میں ڈھالتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی روحانی چٹکلہ نہیں بلکہ مادیاتی سطح پر بھی اس کی بے شمار مثالیں آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

کسی پتھر پر مسلسل ایک ہی جگہ پانی کی بوند گر رہی ہو۔ کون محسوس کرے گا کہ یہ حقیر سی بوند سنگین سطح پر ہلکی سی خراش بھی ڈالنے کی اہل ہو سکتی ہے لیکن ایک مدت بعد آپ دیکھیں گے کہ وہاں گھاؤ نمودار ہو گیا ہے۔ اکیلی ایک بوند واقعتہً بے اثر ہوتی تو کروڑ بوندیں بھی پتھر کی سطح کو متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ ثابت ہوا کہ تنہا ایک بوند میں بھی اثر و نفوذ کی صلاحیت ضرور پائی جاتی تھی۔

آدمی کے گردے یا مثانے میں ننھے ننھے ریزے جمع ہوتے رہتے ہیں اور کافی عرصے تک اسے اس مخفی عمل کا کوئی علم و احساس نہیں ہوتا، مگر یہی ریزے جب مل ملا کر پتھری بن جاتے ہیں تو وہ درد سے کراہ اٹھتا ہے۔ اسی طرح کتنے ہی امراض ہیں جو اپنے ابتدائی مراحل میں قطعاً محسوس نہیں ہوتے لیکن پھر وہ زلزلہ اور بھونچال بن کر ابھرتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں سے لاوا ابلنے کا عمل ہو یا سمندروں میں طوفان آنے کا یہ دفعتاً بلا کسی تدریج کے ظہور میں نہیں آتا بلکہ اس کے پیچھے طبعی مؤثرات کا ایک طویل سلسلہ اور محرکات کی ایک مربوط تکنیک ہوتی ہے۔ آدمی کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ شدتِ غم سے پیدا ہونے والے آنسوؤں اور آہوں کو ضبط کر جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ غم کے داخلی اثرات کو بھی روک دے۔ غم کی شدت جسم کے اندر اپنا کیمیاوی عمل ضرور کرے گی اور ضبط کے نتیجے میں اعصاب اور خلیے ضرور متاثر ہوں گے۔ خوف کو چھپانے کے لئے ہم اپنی چیخ تو روک سکتے ہیں مگر رونگٹوں کو کھڑا نہ ہونے دینا ہمارے بس سے باہر ہے۔ اسی طرح جذبات انگیز مناظر کو ہم ضبطِ نفس کی عینک سے دیکھنے کا مشکل ترین کارنامہ انجام ضرور دے سکتے ہیں لیکن یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ان مناظر کے کہربائی اثرات کو دل و دماغ کے خلیوں اور شریانوں میں نفوذ کرنے سے روک دیں۔

الحاصل جو تفریحات اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ہوس و خواہش کو ہوا دینے والی ہوں وہ لازماً اپنا بُرا اثر طبیعت پر ڈال کر رہتی ہیں خواہ یہ اثر فوری طور پر کسی ردِ عمل کی صورت میں ظاہر نہ ہو۔ اسی لئے اسلام ان سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔ آپ اگر نئی نسل کی اسلام بیزاری سے متفکر ہیں اور متبادل تفریحات تلاش کر کے انھیں "مسلمان" بنانا چاہتے ہیں تو یہ محض شاعرانہ موقف ہے۔ کوئی علاج اس المناک صورتِ حال کا اس انقلابی تکنیک کے سوا نہیں جسے جماعت اسلامی پیش کرتی ہے۔ جماعت اسلامی اسی لئے صالحین کے اقتدار کو کلیدی درجہ دیتی ہے کہ غیر اسلامی تصورِ زندگی نے جو ہمہ گیر قیامت ڈھائی ہے اس کا توڑ ممکن ہی نہیں جب تک ایک صالح اور اسلام دوست اقتدار پورے معاشرے کو خود اپنے نقشے پر تعمیر نہ کرے اور مفاسد کے سرچشموں کو پاٹ کر ایک ایسے تصورِ حیات کو نشو و نما نہ دے جو جسم کے ساتھ روح کے اور ظاہر کے ساتھ باطن کے تقاضوں کو بھی مستقل اور واقعی اہمیت دیتا ہو۔

موسیقی کی شرعی حیثیت

موسیقی اگر خوش آوازی کے ساتھ اشعار پڑھنے کا نام ہے تو اسلام اسے مجرد حیثیت میں حرام نہیں کہتا۔ لیکن اس کے جواز پر جو دلائل ملتے ہیں انھیں "مجرد لپیٹ" فقہاء نے موسیقی کی ترقی یافتہ اقسام کے لئے استعمال کر لیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ضرور تمند عورتوں کے سڑک پر نکلنے اور مسجد میں جانے کو آج کل کی "عورت گردی" اور بے حجابی کے لئے دلیلِ جواز بنا لیا جائے۔ یا جیسے اسلام نے گھوڑ دوڑ کا کھیل پسند کیا ہے تو اسے آج کل کی ریس کے لئے نظیر قرار دے لیا جائے۔

موسیقی اپنی مجرد اور معصوم شکل میں سفلی جذبات کو ہوا نہیں دیتی، لیکن جب ایک طرف اس کے ساتھ چنگ و رباب کا

اضافہ کر لیا جائے اور دوسری طرف اشعار میں "دعوتِ عشق" سمو دی جائے تو یہ سفلی جذبات کے لئے محرک کا کام دیتی ہے اس سے بڑھ کر جب یہ عورت کی آواز میں ڈھل جائے تو پھر تو دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

ہو سکتا تھا اسلام یہاں تک بھی کچھ رعایت دیتا، لیکن آپ اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ یہ آخری حد نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے زمانہ میں نقطۂ آغاز ہے۔ آگے ہم اس تلاش میں قدم بڑھاتے ہیں کہ موسیقار کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں، اور پھر فقط دیکھنے ہی پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ ہم چاہتے ہیں وہ ناچے بھی اور ناچ کا لباس ایسا ہو کہ ایک ایک عضو کی ساخت ہمارے لئے کھلی کتاب بن جائے۔

یہ دراصل فلسفہ و منطق کا مسئلہ نہیں بلکہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ ہر لذت آدمی کو ایک اور لذت کی طرف بڑھاتی ہے اور ایک قدم اٹھانے کے بعد دوسرا قدم خود بخود اٹھ جاتا ہے۔ موسیقی انسانی وجدان کو لذتِ انبساط عطا کرتی ہے تو اس کے اندر اس لذت کو زیادہ ترقی یافتہ شکل میں حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور جب یہ ترقی یافتہ شکل میسر آجائے تو آرزو مزید پیر پھیلاتی ہے۔ یہاں تک کہ لذت طلبی کا یہ میلان جنسی تلذذ کے آخری مراحل سے پہلے سرد نہیں ہوتا بلکہ حقیقتاً یہ آخری مراحل میں بھی ھل من مزید ہی کی رٹ لگائے رکھتا ہے اور موت کے سوا اس کے آگے کبھی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوتی۔

ضروری نہیں کہ موسیقی کا ہر رسیا بیاہ کار دین کے راستے پر نکل ہی جائے۔ مگر اعلیٰ مقاصد و عزائم اور بلند تصورات پر یہ شوق ضرور برا اثر ڈالے گا۔ بحث صرف اتنی ہی نہیں کہ ریڈیو پر اگر کوئی فلمی ریکارڈ چل رہا ہو تو اسکو بغور سن لینے سے ہم کسی حرام کے مرتکب ہوئے یا نہیں بحث اس سے آگے کی ہے۔ یہ ایک گانا صرف ایک کڑی ہے اُس لمبی زنجیر کی جسے آدمی کے ذہن و مزاج کے گرد لپیٹ دینا مروجہ تعلیم و تربیت کا طبعی تقاضہ ہے۔ اسی ایک گانے پر بات نہیں رہ جاتی۔ قدم اس تفریح کے راستے پر اور آگے اور آگے بڑھتے ہیں اور بالآخر وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ناچ رنگ، سینما تھیٹر اور مرد و زن کی مخلوط تفریحات کے بغیر زندگی سپاٹ، بے کیف اور بوریت کا پلندہ نظر آنے لگتی ہے۔

یہ رخ، یہ میلان اسلام کو پسند نہیں۔ وہ کسی حال میں گوارا نہیں کرتا کہ تفریحات و لذات کے ہجوم میں آدمی کا ذہنی تعلق خدا سے، آخرت سے، اخلاقی قدروں سے کٹ جائے یا مضمحل ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دن میں پانچ نمازیں فرض کیں۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا کی رنگینیاں آدمی کو کس خوفناک حد تک اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں گم گشتگی اور مغلوبیت کی اسی قباحت کا علاج اس نے نماز کے ذریعہ کیا۔ نماز چاہے کیسی ہی روا روی میں پڑھی جائے، پڑھنے والے کے خیالات خواہ کتنے ہی پراگندہ ہوں، لیکن یہ بہرحال محسوس و مرئی شہادت ہے اس بات کی کہ مسلمان کے ذہن و قلب میں خدا اور آخرت کا خیال زندہ ہے۔

لہذا ہمیں تنہا ایک گانے، تنہا ایک فلم، تنہا ایک ڈانس کی انفرادی حیثیت تک محدود رہ کر حلال و حرام اور نفع و نقصان کے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی ہے جو اپنی جنس اور خاندان کی دوسری چیزوں سے منقطع ہو۔ اگر نہیں ہے تو پھر بحث فقط ایک چیز کی نہیں رہ جاتی بلکہ اس بات کی رہ جاتی ہے ـــــ کہ ایک مسلمان خدا فراموشی کی زندگی منتخب کرے یا خدا پرستی کی۔ وہ مشرق کی طرف چلے یا مغرب کی۔

کچھ مسز حمید کے خط سے متعلق

ہمیں احساس ہے کہ گفتگو خاصی لمبی ہو گئی لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس طول کو معیوب نہیں سمجھنا چاہیئے۔ فاران میں مسز حمید کے خط کا جواب مدیر فاران نے بہت اچھا دیا ہے مگر خط کے بعض مطالب پر ہم بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

صورت یہ ہے کہ مسز حمید اسکول میں لڑکیوں کا ایک ڈانس دیکھتی ہیں جس میں ہندوؤں کی مشہور "روایت" "پنہارن" کی

کرشن پروانہ وار فریفتگی ــــ ڈرامے کی شکل میں دہرائی گئی ہے۔

اسے دیکھ کر مسز حمید کو صدمہ پہنچا ہے اور اس طرح ــــ کے "آرٹ" کے مفسدانہ پہلوؤں کا انھیں شدید احساس ہوتا ہے جسے وہ اپنے خط میں سپردِ قلم کرتی ہیں۔ یہ تو بے شک اسلامی دردمندی کا مظاہرہ ہوا' لیکن جب وہ دردمندی کا اظہار اس طرح کے الفاظ میں کرتی ہیں کہ:۔

"یہ اسلامی حور ہیں سخت گیر مولانا اور سفید ریش واعظ سے گھبرا کر آخر بنسری والے کرشن کی پناہ کیوں ڈھونڈ رہی ہیں؟"

تو بدگمانی ہوتی ہے کہ ان کی دردمندی فکری خلوص پر مبنی نہیں ہے۔ آخر "سخت گیر مولانا اور سفید ریش واعظ" پر پھبتے اڑانے کا یہ کونسا موقعہ تھا۔ اگر اس "مخلوق" سے اتنی ہی بیزاری تھی کہ بے محل بھی اس پر پھبتی کسنا اقتضاءِ طبع قرار پایا تو بے حجابی' فحاشی اور اخلاقی رذالتوں کے مظاہرے تو مسز حمید کو خوش ہونا چاہیے کہ ان پر کڑھنے اور غم کرنے کی رسوائی تو سخت گیر مولانا اور سفید ریش واعظ ہی کے حصے میں آئی ہے۔

پھر حیرت انگیز ارشاد یہ ہے کہ:۔

"مجھے ان طلباء یا ٹیچر میں سے کوئی شکایت نہیں بلکہ ان کی سچی خیرخواہ ہوں' لیکن شکایت ہے تو اسلام سے"

یعنی خود ہی مسز حمید اس نوع کی تفریح کو نوخیز طلباء کے لئے ضرررساں بھی خیال کرتی ہیں اور خود ہی اس کی بھی شاکی ہیں کہ اسلام نے انھیں جواز کیوں نہیں دیا۔ ڈانس لڑکیاں کریں مگر مجرم قرار پائے اسلام۔ شکوہ نہ مرتکب سے ہے نہ محرک سے۔ بس اسلام سے ہے جو ارتکاب اور تحریک دونوں کا مخالف ہے۔ یہ عجیب طرح کا اندازِ فکر ہے۔

آگے کہا گیا ہے:۔

"انسان آخر انسان ہے وہ کب تک طربیہ پہلو سے دامن بچاتے ہوئے ساری زندگی محرومی میں گذار سکتے ہیں' جب کہ دنیا کی بساط ان کے سامنے کھلی ہوتی ہے۔ آخر خدائے تعالیٰ کو کچھ تو اپنے بندوں کی فطرت کا خیال ہونا چاہیے۔"

جن تصویحات پر ہم تفصیلی روشنی ڈال آئے ہیں وہی مسز حمید کے اسلوبِ فکر میں بھی کارفرما ہے۔ وہ صاف لفظوں میں اس یقین کا اظہار کر رہی ہیں کہ طربیہ پہلو صرف ایسی ہی تفریحات میں محدود ہے جو مرد و زن کے اختلاط سے تشکیل پاتی ہوں۔ اگر اسلام ایسی تفریحات کو ممنوع قرار دیتا ہے تو ان کے نزدیک انسان کی ساری زندگی طربیہ پہلو سے محروم گذرے گی ــــ گویا ایک عورت بھی ــــ اگر مسز حمید واقعۃً عورت ہوں ــــ اس فیصلے پر پہنچ چکی ہے کہ عورت ذات کو شرم و عفت کے اسلامی تصورات ذہن سے جھٹک کر مردوں کی تفریح اور طرب انگیزی کے لئے خود کو کھلونا بنا دینا چاہیے تاکہ ان بیچاروں کی زندگی احساسِ طرب سے محروم نہ گذرے۔ اگر عورت قدم قدم پر جلوہ طراز نہ ہوگی' اگر عورت اسٹیج پر نہیں ناچے گی' اگر عورت فلموں میں' ڈراموں میں' کلچرل سرگرمیوں میں' کلبوں میں' بال روموں' دعوتوں میں' پکنکوں میں مردوں کے فطری تقاضوں کو آسودہ نہیں کرتی رہے گی تو پھر دنیا میں مردوں کے لئے تفریح' لذت اور عیش و طرب کا کوئی سامان ہی نہیں۔

کتنا پست اور غیرت سوز ہے یہ اسلوبِ فکر اگر سچ مچ یہ کسی عورت ہی کا ہو! پھر مولانا اور واعظ کو نشانۂ ملامت بنانے کے بعد محترمہ نے "خدا" کو بھی نہیں چھوڑا گویا خدا اگر جنسی و شہوانی محرکات پر روک ٹوک کرتا ہے تو محترمہ کا خیال ہے کہ یہ روک ٹوک بندوں کی فطرت کا خیال نہ کرنے کے مرادف ہے۔

خدا جانے ہمارے "مولانا دشمن" "عقلاء" "فطرت" کس معنی میں بولتے ہیں اور کس حد تک آزادی کے طالب ہیں۔ جنسی تعلق انسان کی فطرت ہے۔ اس فطرت کی آسودگی کے لئے اللہ نے جائز راہیں متعین فرمائی ہیں۔ اب اگر وہ تمام تفریحات فطرت کی پاسداری میں جائز ہونی چاہئیں جو جنسی خواہشات کو جائز راہوں سے ہٹا کر غلط راہوں پر لے جاتی ہیں تو پھر تو جائز اور ناجائز کا امتیاز ہی بے کار ہوا۔ ایک مرد جب بیوی کے علاوہ کسی سے جنسی تعلق قائم کرتا ہے تو یہ بھی فطرت ہی کا ایک رُخ ہوتا ہے اور کوئی عقل مند اسے غیر فطری فعل قرار نہیں دے سکتا۔ پھر کیوں نہ ہم زنا کی ممانعت پر بھی یہی الزام خدا کے سر رکھ دیں کہ وہ بندوں کی فطرت کا کچھ بھی خیال نہیں کرتا!

مسز حمید نے آگے ایک ایسی عجیب بات کہی ہے جس سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سیاہ وسفید کی تمیز میں دھوکا کھا گئی ہیں بلکہ یہ خواہش رکھتی ہیں کہ ہر سال زیادہ نہیں تو کم از کم ایک دن ایسا ضرور آنا چاہیئے جب آدمی پر سے ہر طرح کی پابندیاں ہٹالی جائیں اور مرد وزن کی دونوں صنفیں کامل آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اپنی تمام خواہشات پوری کرلیں۔

اسی شکوے کے تحت کہ "آخر خدائے تعالیٰ کو کچھ تو اپنے بندوں کی فطرت کا خیال ہونا چاہیئے" انھوں نے فرمایا:۔

"دوسرے مذاہب نے اپنے پیرووں کو سال میں چند یا کم از کم ایک دن ایسا عطا کیا ہے جس میں وہ پاسبانِ عقل سے بھی چھٹکارا حاصل کرکے بالکل اپنی بہیمانہ اور وحشیانہ فطرت میں آزاد چھوڑ دیئے جاتے ہیں لیکن اسلام ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی شرف بنی آدم سے محروم نہیں کرتا نہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں ہمیں لباسِ التقویٰ سے باہر آنے کی اجازت دیتا ہے۔"

یہ اسلام کی تحسین میں نہیں بلکہ شکایت میں کہا گیا ہے اسی لئے ہم نے عرض کیا کہ محترمہ سیاہ وسفید کی تمیز میں دھوکا کھا گئی ہیں یہ بات شکایت کی نہیں تعریف کی تھی۔ تاسف کی نہیں مسرت کی تھی۔ لیکن انھیں شکایت اور تاسف ہے۔

ویسے یہ ہم نہیں سمجھ سکے کہ کونسے قابلِ ذکر مذہب نے انسان کو ایسا کوئی دن دیا ہے جس کا تذکرہ محترمہ نے فرمایا۔ ہمیں بتایا جائے کہ عیسائیت یا یہودیت یا کس مذہب نے یہ تعلیم دی ہے کہ سال کے فلاں ہفتے یا فلاں دن میں آدمی تمام اخلاقی قوانین کی گرفت سے چھٹکارا پاکر شہوات وخواہشات کی من مانی تکمیل میں آزاد ہے۔ مدیر فاران نے ممکن ہے اس منقولہ عبارت کا مفہوم ومنشا سمجھ لیا ہو ورنہ جواب میں اس کا ذکر تو آتا۔ وہی ہمیں سمجھائیں کہ یہ کیا کہا گیا ہے۔

اور مان لو دوسرے مذاہب ایسا کوئی ہفتہ یا دن دے بھی دیں تو کیا یہ کوئی ایسی نعمت ہوگی جس پر رشک کیا جائے۔ کیا محترمہ کے نزدیک وہی آزادی لائقِ تمنا بھی ہوسکتی ہے جسے وہ خود "بہیمانہ اور وحشیانہ فطرت" سے منسوب کررہی ہیں؟۔

"اب بتایئے ہم شکر کریں یا شکوہ۔"

یہ مذکورہ عبارت سے متصل بعد کا فقرہ ہے۔ ظاہر ہے وہ شکوہ ہی کررہی ہیں مگر ہم کہیں گے کہ یہ شکوے کا نہیں شکر کا مقام ہے۔ اگر عفیفہ اُس عورت کو کہیں گے جو سال کے تین سو چونسٹھ نہیں بلکہ پینسٹھ دنوں میں عفت مآب رہے تو طاہر ومطہر مذہب بھی وہی کہلائے گا جو سال کے پورے تین سو پینسٹھ دنوں میں انسان پر انسان بنے رہنے کی پابندی عائد کرے نہ یہ کہ کسی دن انھیں جانور بننے کی بھی اجازت دیدے۔

محترمہ کہتی ہیں:۔

"تعلیم حاصل کرنا فرض ہے۔"

ہم کہتے ہیں آج کی سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ جس چیز کا نام تعلیم رکھدیا گیا ہے وہ اصلاً تعلیم ہے ہی نہیں بلکہ ایسی جاہلیت ہے جسے مسلح کردیا گیا ہو۔ اگر محترمہ کو قرآن پر اعتماد ہے تو وہ اسی کو کھول کر دیکھیں کہ اس میں علم کسے کہا گیا ہے اور جہالت کسے۔ علوم وفنون کا جو مجموعہ آج تعلیم کے نام پہ چل رہا ہے اس کے بیشتر اجزاء ترکیبی اگرچہ بڑے قیمتی ہیں اور ان کی ذاتی افادیت واہمیت کا نہ صرف یہ کہ اسلام منکر نہیں ہے بلکہ قدرشناس بھی ہے لیکن اس مجموعہ کا مزاج اُس تصورِ زندگی اور فلسفۂ حیات نے فاسد کردیا ہے جس کی لائنوں پر اس کی تدوین ہوئی ہے۔ یہ اُس خوش رنگ مشروب کی مانند ہے جسے بہترین اجزاء سے تیار کرکے شیشے کے نفیس جگ میں رکھدیا گیا ہو لیکن ساتھ ہی اس میں زہر کی آمیزش بھی ہو۔ اسے پینے والوں میں سے اگر کچھ خوش قسمت زندہ بچ جاتے ہیں تو اسے ان کی غیر معمولی قوت مدافعت کا کرشمہ سمجھیئے ورنہ یہ ہر آئینہ زہر ہے اور اس پہ زہر ہی کا لیبل لگایا جائے گا چاہے مقدار اور وزن کے اعتبار سے اس کے دیگر قیمتی اجزاء زہر کے مقابلے میں سوگنا ہوں۔

یہ تعلیم بڑی فنکاری اور چابک دستی سے ایسے دل و دماغ تیار کرتی ہے جو فرد اور معاشرے کو لذت پرستی، اخلاق بیزاری اور عاقبت فراموشی کی وادی میں آگے ہی آگے ڈھکیلتے

چلے جائیں۔ یہ دل و دماغ کو روشنی، توانائی، تیزی، طراری اور سلیقہ سب کچھ عطا کرتی ہے مگر ساتھ ہی یہ جذبہ بھی عطا کرتی ہے کہ ان ساری صلاحیتوں کو جاہلیت ہی کے فروغ پر کھپایا جائے۔ ایسے ہی رخ پر استعمال کیا جائے جو خدا اور آخرت کے خیال سے دور ہی دور لے جانے والا ہو۔

یہ مولویانہ سخت گیری نہیں بلکہ آنکھوں سے نظر آنے والا امرِ واقعہ ہے۔ روحانیت، اخلاق اور پاکبازی کا جو عبرتناک زوال دنیا بھر میں روز افزوں ہے اور مسلمان مملکتیں بھی جس تیزی سے اس زوال کی رو میں بہتی جا رہی ہیں وہ قطعی دلیل ہے اس نام نہاد تعلیم کے عین جاہلیت ہونے کی۔

پھر محترمہ فرماتی ہیں:۔

"عملی زندگی فرض ہے اور تفریح اس دور کا اہم ترین مسئلہ ہے۔"

عملی زندگی سے ان کی مراد عام دنیاوی سرگرمیاں ہیں۔ بے شک دنیاوی سرگرمیاں بھی ضروری ہیں لیکن عجیب بات ہے عملی زندگی کے دائرے میں نماز جیسے رکن اعظم کو کوئی جگہ نہیں دی گئی حالانکہ ایک مسلمان کی اپنی زندگی میں اس سے بڑھ کر اہم اور غیر منفک فرض کوئی بھی نہیں۔ نماز اگر محترمہ کے دائرۂ خیال میں ہوتی تو فطری طور پر وہ نام نہاد گھٹیا تفریحات کا اسلامی بدل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی ضرور کرتیں کہ طلبا کو نماز پر کس طرح مائل کیا جائے۔

انھیں غم ہے کہ اسلام کی طرف سے تفریحات کا کوئی خوانِ نعمت نہ ملنے کی وجہ سے طلبا مکروہات میں مبتلا ہو رہے ہیں لیکن یہ نہیں محسوس فرماتیں کہ اسلام کی طرف سے کچھ ملنے نہ ملنے کی انھیں پرواہ ہی کب ہے۔ اسلام نے پانچ وقت نماز پڑھنے کی تاکید پر تاکید، وعظ و پند، تبشیر و تنذیر اور اصرار و تکرار کے سارے اسلوب ختم کر دیئے مگر اسکول اور کالجوں میں اس آواز پر کان دھرنے والوں کا تناسب آٹے میں نمک کی برابر بھی نہیں۔ پھر اسی کا کیا غم ہے کہ طلباء اور طالبات بلکہ اسٹیج پر کرشن کنھیا کا ڈرامہ کھیل رہے ہیں یا چست لباسوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یا رومانس کے تانے بانے پھیلا رہے ہیں

محترم بہن! اب ان مقبول تفریحات کا متبادل ڈھونڈنے میں وقت برباد مت کیجئے اب تو چشم عبرت سے یہ دیکھئے کہ مسلمانوں کا معاشرہ کتنی تیز رفتاری سے مغربی طرز زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے اور مر جانے والا دین و اخلاق کی کتنی قدروں کے جنازے دوش پر اٹھائے سیاہ رات کی قبر میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کا یہ ارمان کہ "سخت گیر علماء" دین و شریعت کے احکام کو نرم کر کے نوجوانوں کے آگے اس طرح کی تفریحات پیش کریں جو اسلامی بھی ہوں اور ان نوجوانوں کے لئے کشش آمیز بھی ایک شاعرانہ یا طفلانہ تخیل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جائز آسائشوں اور تفریحوں پر تو اسلام نے کبھی بھی اعتراض نہیں کیا ہے لیکن اس نیرنگیِ زمانہ کو علماء کیا کریں کہ جدید تعلیم و تربیت نے قلوب و اذہان کو ڈھال ہی دیا ایسے سانچوں میں جو نیکیوں سے بیزار ہوتے اور گناہوں میں آسائش و تفریح محسوس کرتے ہیں۔ کوئی علاج کسی جزوی اصلاح سے نہیں ہوگا جب تک معاشرے کی گاڑی کی سمتِ سفر ہی نہ بدل دی جائے۔ ایک زخم پر پھاہا رکھو گے تو فاسد خون دو چار نئے پھوڑے پھنسی ابھار دے گا۔ برائی کی ایک شاخ کاٹو گے تو دوسری شاخ سے دس کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ یا تو اس شجرِ خبیث کو جڑ سے اکھاڑنے پر جان لڑا دو ورنہ جو پھل پیدا ہو رہا ہے انھیں چکھو اور جو پھول اس میں کھل رہے ہیں انھیں سونگھو۔

اگر کسی کو ناچ گانے، قمار و سود، شراب و زنا نہیں بھاتے

اگر کسی کی تمنا ہے کہ طلباء و طالبات کی تفریح کا رخ بدل جائے خوب و ناخوب کے معیار بدل جائیں تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تمنا اسلام کی "سخت گیری" کا خاتمہ کرنے اور حلال و حرام کے رخ پر بیش از بیش رعایتیں دینے کی حکمت عملی سے پوری ہونے والی نہیں۔ جنسی دائرے میں انسان کی فطرت ہے کہ مرصّع جسموں کو دیکھنے کی اجازت دو گے تو وہ انھیں چھونا بھی چاہے گا اور چھونے کی بھی رعایت دیدی تو وہ دو قدم اور آگے بڑھے گا۔ تمنا پوری ہونے کی صرف ایک ہی راہ ہے کہ اس تصورِ زندگی سے فیصلہ کن جنگ کی جائے جو روح کی لاش پر اپنے اہرام بناتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اسلام کا بدترین

دشمن ہے لہٰذا اس سے مفاہمت کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے پسپا ہونے ہی پر اسلام کی صبح طلوع ہو سکتی ہے ورنہ جب تک یہ مسلط ہے ہمیں کڑھتے، روتے اور پھر برائیوں سے مانوس ہوتے زندگی گذارنی پڑے گی۔ گذار ہی رہے ہیں۔ آج وہ وقت تو آ ہی گیا ہے جب ہم اپنی جوان بیٹی اور بہن کو برابر بٹھا کر بڑے شوق سے وہ فلمیں دیکھتے ہیں جن میں ایک اجنبی جوڑے کا رومان اتنا ہی ضروری ہے جتنا جینے کے لئے سانس لینا۔ پھر یہ بھی ہم احساسِ حیا کے بغیر ہی نہایت دلچسپی سے دیکھتے ہیں کہ اس جوڑے کے مراحلِ عشق کسی پارک یا وادی یا کلب میں طے ہو رہے ہیں اور کوئی خیال نہیں ہوتا کہ جوان بیٹی اور بہن کی معیت میں یہ تماشہ بینی عفت و حیا کے دامن پر بھی کوئی سلوٹ پیدا کر رہی ہے نہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ تماشا بہن اور بیٹی کے ذہن و قلب پر کس قسم کا اثر چھوڑے گا۔

تو آخر ہو کیا؟

سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جس ہمہ گیر اور جامع انقلاب کو واحد علاج قرار دیا جا رہا ہے وہ تو ایک موہوم سی چیز ہے۔ اتنی موہوم کہ ایک شاعرانہ تمنا سے زیادہ فی الحال اسکی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر جب تک وہ نہیں آتا ایسے لوگ کیا کریں جو نئی نسل کو منکرو ہات میں مبتلا دیکھ کر روحانی اذیت محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر صرف ایک ہی فرض عائد ہوتا ہے یہ کہ وہ اپنی مقدرت کی حد تک اُس گروہ کی مدد کرے جو اس انقلاب کا داعی ہے۔ جو اس کی خاطر اپنی جانیں لڑا رہا ہے۔ جس نے اس کے لئے کافی دور تک راہیں ہموار کی ہیں جو انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس کے فکری خطوط کھینچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ آخرت میں مسز حمید کو یا ہمیں صرف یہ حساب دینا ہوگا کہ خود ہمارا کردار کیا رہا۔ ہم نے اپنی توانائیاں کس راہ میں صرف کیں۔ ہم نے کس حد تک خدا کی اطاعت کی۔ یہ نہیں دینا ہوگا کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب کس لئے نہیں ہوئے۔ اللہ اعلان کر چکا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (اللہ نے کسی ذی روح پر اس کی مقدرت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی) لہٰذا نتائج کچھ بھی ہوں آدمی کا کام صرف کوشش ہے۔ صحیح خطوط پر جی جان سے کوشش۔

یہ جو مسز حمید اور ان جیسے دردمند بندگانِ خدا کو اسلام ہی کی محبت میں اس طرح کی باتیں سوجھتی ہیں کہ اسلامی تہذیب سے منھ موڑ کر کافرانہ تہذیب کے رنگ میں رنگے جانے والے افراد کے لئے علماءِ شریعت کے اوامر و نواہی میں کچھ رعایتیں پیدا کریں تاکہ ان رعایتوں کی کشش ان افراد کو اسلام کی طرف کھینچ لائے یہ فقط ذہنی تحیّر اور فکری تعطل کی ایک اُپج ہے۔ اس طرح اصلاحِ حال تو کیا ہوتی، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ عملی بے راہ روی کے باوجود عقائد کی شکل میں جو تھوڑا بہت ایمان ذہنوں میں بچا کھچا پڑا ہے وہ بھی تحلیل ہو جائے گا اور فسق و فجور کفر و زندقہ سے بدل جائیں گے۔ جن برائیوں کو ہم مٹا ڈالنے پر قادر نہیں انھیں کم سے کم برائی سمجھتے رہنا ہی ایمان کا ایک درجہ ہے لیکن ضمیر کی خلش مٹانے کے لئے اگر ہم انھیں بُرا سمجھنا بھی چھوڑ دیں یا انھیں ناگزیر اور لازمی بُرائیاں قرار دے کر مطمئن ہو جائیں تو یہ ایمان کی موت ہوگی۔ کسی دانشور نے خوب کہا ہے کہ جب ہم کسی برائی کو لازمی قرار دیکر ضمیر کو مطمئن کر دیتے ہیں تو پھر کچھ دنوں بعد "لازمی" کا لفظ ذہن سے غائب ہو جاتا ہے اور برائی ہی برائی باقی رہ جاتی ہے!

اسلامی انقلاب کے داعیوں کی حتی الوسع مدد کرتے رہو اور ہر برائی کو برائی ہی سمجھو چاہے وہ ہوا اور پانی کی طرح عام ہو جائے!

هٰذا ما عندی والعلم عند اللّٰہ۔

نسائی شریف اُردو مع عربی

حدیث کی چھ معیاری کتابیں ہیں ۔۔۔ جنھیں اصطلاحاً صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ نسائی بھی شامل ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ مع عربی متن ملاحظہ فرمائیے۔ تین جلدوں میں مکمل مجلد

ھدیہ تیس روپے

مکتبہ تجلّی دیوبند

اچھی کتابیں

تفسیر سورۂ نور از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
سیرت و اخلاص کو سنوارنے والی
آسمانی ہدایات پر مشتمل سورہ نور کی بہترین تفسیر، بلیغ، نفیس اور محققانہ۔
قیمت مجلد چار روپے ‏ ‎4/-‎

کیا ہم مسلمان ہیں؟ شمس نوید کے مطبوعہ
اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا مجموعہ
سوز و گداز، وا لہیت، اخلاص، درد اور دل کشی کا گنجینہ۔
قیمت مجلد سوا دو روپے ‏ ‎2/25‎

ردِ بدعت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمرد واشتی کی روشنی میں
بعض ایسی بدعات کا رد جو عوام ہی میں نہیں خواص
میں بھی مقبول و مروّج ہوئی ہیں۔ قیمت سوا روپیہ ‏ ‎1/25‎

تحقیق مزید "خلافت معاویہؓ و یزید" کے مصنف جناب
محمود احمد عباسی کا نقش ثانی جو بہت سا تاریخی
مواد آپ کے غور و فکر کیلئے پیش کرتا ہے صحابہؓ کے سلسلے میں کسی اطمینان
بخش نتیجے تک پہنچنے کے لئے یہ کتاب فکری بنیادیں مہیا کرتی ہے۔
قیمت مجلد آٹھ روپے ‏ ‎8/-‎

بدعت کیا ہے؟ بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات
میں ایک مشہور و مقبول کتاب، قوالی، تیجہ، چہلم، الایصال ثواب کیلئے چیلنج۔ مجلد تین روپے ‏ ‎3/-‎

فاران کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب
میں بڑی شہرت پا چکا ہے اب پھر
شائع کیا گیا ہے بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں
بے نظیر چیز ہے۔ چوٹی کے علماء کے مقالات سے مزین۔ ساڑھے چار
روپے، مجلد ساڑھے پانچ روپے۔ شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر
پہلے کی طرح ختم ہو جائیگا، اور فرمائشیں بیکار کرنی پڑیں گی۔

باندیوں کا مسئلہ (الله المستعان) جہاد میں ہاتھ آئی
ہوئی عورتوں کو
باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت، کتاب کے مصنف کا ایک خط
اور مولانا ابوالکلام آزاد کا جواب بھی شامل ہے ڈیڑھ روپیہ ‏ ‎1/50‎

الوسیلہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں
وابتغوا الیہ الوسیلۃ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے
کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ قیمت مجلد نو روپے ۔ (ن[وٹ]) ‏ ‎9/-‎

الفرقان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے ایک روح افزا رسالے
کا اردو ترجمہ جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور
ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے۔
مجلد مع حسین کور چار روپے ‏ ‎4/-‎

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابی کے علم و فضل، ان کی سوانح،
کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات۔
قیمت پوتھی بار(؟) دو روپے ‏ ‎1/75‎

غنیۃ الطالبین شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے شہرۂ آفاق
مضامین عالیہ عربی اور اس کا سلیس ترجمہ
ساتھ ساتھ۔ لاجواب تحفہ دو ضخیم جلدوں میں۔ قیمت مکمل ۲۴ روپے۔

مسلم شریف اردو مع عربی لیجئے حدیث کی مشہور و
مستند کتاب مسلم شریف
کا بھی اردو ترجمہ لیجئے۔ بلکہ اس کی جو شرح، شرح نوویؒ کے نام سے
مشہور ہے اور تمام مدارس میں چل رہی ہے اس کا بھی ترجمہ ساتھ ہی شامل
ہے نعمت غیر مترقبہ۔ ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی۔
مکمل چھ جلدوں میں۔ ہدیہ اڑتالیس روپے ‏ ‎48/-‎

ابن ماجہ اردو کامل حدیث کی جو چھ کتابیں صحاح ستہ
کے نام سے مشہور ہیں ان میں ایک
ابن ماجہ بھی ہے اس کا عام فہم اردو ترجمہ صرف بارہ روپے میں ‏ ‎12/-‎

مکتبہ تجلّی ۔ دیوبند یو۔پی

القاموس الجدید

ایک عمدہ اردو عربی ڈکشنری۔ عربی سیکھنے والے شائقین کیلئے تحفۂ نادرہ۔ آپ اردو کے کسی بھی لفظ کا عربی مرادف آسانی سے پا سکتے ہیں۔ نئے زمانہ کی اصطلاحات اور ناموں وغیرہ کے بھی عربی تراجم ملیں گے جو پرانی لغتوں میں نایاب ہیں۔

قیمت مجلد سات روپے

مکاتیب زنداں

جیل سے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور میاں طفیل محمد کے خطوط دو روپے

سنتِ خیر الانام

فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک نفیس کتاب۔ اس کے مطالعہ سے عام قارئین کو حدیث کی اقسام اور مراتب و درجات وغیرہ کے بارے میں بڑی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ قیمت مجلد چار روپے

تاریخ دعوت و عزیمت

مولانا علی میاں ندوی کی ایک معرکۃ الآرا کتاب جس میں بڑی تحقیق کے ساتھ ابتدائے اسلام سے آج تک کی دعوت و عزیمت کی تاریخ پیش کی گئی ہے ائمہ مجددین اور صلحاء و علماء کے نادر حالات۔ حصہ اول ساڑھے چھ روپے حصہ دوم ساڑھے چھ روپے حصہ سوم پانچ روپے

المنجد

دنیا کی مشہور ترین عربی ڈکشنری۔ اردو داں حضرات کیلئے اس عظیم ڈکشنری کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے یعنی عربی الفاظ کی تشریح اردو میں۔ بے شمار خاکوں اور اشیاء کی تصویروں سے مزین۔ مجلد تیس روپے۔

حیات ابو حنیفہ رح

امام اعظم رح کے علم و فضل، مدارک فکر، کمالات اور خصوصیات پر مصر کے جلیل القدر محقق استاذ ابو زھرہ کی لاجواب تالیف جس کا اردو ترجمہ رواں اور سلیس ہے قیمت مجلد پندرہ روپے۔

حیات ابن تیمیہ رح

یہ کارنامہ بھی استاذ ابو زھرہ کی کا ہے۔ اعلیٰ تحقیق، نفیس تنقیح، ناقدانہ تجزیئے، ماہرانہ تنقید، مبسوط و مفصل۔ مجلد اکیس روپے

حیات امام احمد ابن حنبل رح

اور اس کا مصنف بھی استاذ ابو زہرہ ہی کا سحرا

ہی کے سر ہے جو علم و تحقیق کا دریا اور بصیرت و فراست کا بدیعہ ہیں ائمہ کے تذکرے لکھنے کا حق یہ ہے کہ انہوں نے حق ادا کر دیا ہے۔

قیمت نو روپے۔

حیات امام ابن القیم رح

مصنف: عبد العظیم عبد السلام شرف الدین استاذ جامعۃ القاہرہ۔ مترجمہ:- حافظ سید رشید احمد ارشد ایم اے۔ آٹھویں صدی کے مشہور عالم امام ابن تیمیہ رح کے شاگرد رشید اور رفیق حافظ ابن القیم الجوزیہ کی سوانح عمری اور فقہ، عقائد اور تصوف پر آن کے بیش بہا افکار کا مجموعہ وہ گراں قدر کتاب جس کی تصنیف پر جامعۃ القاہرہ مصر نے مصنف کو اسلامیات کی اعلیٰ ترین سند عطا کی۔ قیمت بارہ روپے۔

عہد لارڈ ماونٹ بیٹن

مصنف: کیمبل جانسن۔ مترجمہ: یونس احمد ایم اے

تقسیم ہند کی مستند داستان۔ ماضی قریب کی تاریخ کا اہم ترین باب۔ ایسے حقائق کی دستاویز جن پر سیاست گری کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دلچسپ اور عبرت انگیز۔

قیمت مجلد بارہ روپے۔

زبدۃ المناسک مکمل ڈھائی تل

از عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی مع اضافۂ مفیدہ کثیرہ جس میں جملہ مسائل حج کو اردو زبان میں نہایت تفصیل سے مع حوالجات کتب ترتیب دیا گیا ہے۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں اس سے زیادہ مستند کتاب مسائل حج پر موجود نہیں ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔

قیمت مجلد آٹھ روپے۔

بلاغ المبین (اُردو)

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی ایک ایمان افروز کتاب جو شرک و بدعت کے رد میں شمشیر بے نیام سمجھی جاتی ہے۔

قیمت چار روپے

مکتبہ تجلّی دیوبند یوپی

مراسلہ

از:- جناب جلال الدین صدیقی

مدرسۃ الاصلاح اور مولانا شاہ عبدالغنی مرحوم

ماہنامہ ...... دیوبند نے ستمبر ۶۳ء کی اشاعت میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری کی وفات پر اپنے تاثرات تحریر کرتے ہوئے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڈھ) کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قدم میں جب کبھی تزلزل پیدا ہوتا تھا مولانا سینہ سپر ہو کر اسکی اصلاح کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔"

اس تحریر سے ان لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی ہے جو مدرسے کی تاریخ اور واقعات سے بے خبر ہیں اس لئے نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ اس کی تردید اور اصل صورت حال کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے۔

الحمدللہ مدرسۃ الاصلاح کے قدم میں کبھی تزلزل نہیں پیدا ہوا اور اس نے گوناگوں مخالفتوں کے باوجود نہ کبھی اپنے اصول و مقصد سے انحراف کیا اور نہ اپنے مقدس بانیوں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمیدالدین فراہی رحمہما اللہ کے بنائے ہوئے خاکہ اور دستور کو ترک کرنا پسند کیا، حضرت مولانا عبدالغنی صاحب جس بنا پر مدرسہ کی مخالفت یا مدیر ..... کے لفظوں میں اس کی اصلاح کے لئے سینہ سپر ہوئے تھے وہ در اصل اسکا تزلزل نہ تھا جیسا کہ ..... کے فاضل مضمون نگار اپنے ناظرین کو باور کرانا چاہتے ہیں، بلکہ اس کی صحیح حقیقت اور نوعیت صرف اس قدر ہے کہ مدرسہ کے ابتداء میں خود حضرت مولانا پھولپوری کا بھی اس سے تعلق رہا ہے، لیکن بہت جلد مولانا فراہی کے زمانے ہی میں بعض اختلافات کی بنا پر انھوں نے مدرسہ سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل "حیات شبلی" کے مصنف اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کے سابق ناظم اعلے مولانا سید سلیمان ندوی کی زبان سے سنئے:-

"..... آس پاس[1] میں "علمائے زمانہ" کی کمی نہیں، انھوں نے اس کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم کیا اور اپنے مدرسے کے چلانے کے لئے یا اپنے زعم میں نیک نیتی سے وقتاً فوقتاً مدرسۃ الاصلاح کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو اس کی امداد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے لیکن۔ "دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر ست" ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی اور مدرسۃ الاصلاح[2] کا کام بڑھتا ہی رہا ..... یہ جاہدیہ ترقی مخالفوں کے سامان "ہیزم کشی" کے لئے آگ ثابت ہوئی۔ انھوں نے اس کی تباہی کے لئے اپنے آخری بے پناہ حربہ "کافر گری" کو استعمال کیا اور چند علماء کو مولانا شبلی اور مولانا حمیدالدین کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتویٰ لے آئے ..... ایک دن جن لیے علماء بلا کر لے آئے جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی و اخلاقی گالیاں دے سکیں چنانچہ مدرسہ کے قریب کی ایک زمین میں جلسہ جما کر تین روز تک ہم ان دو مرحومین کو اور ان کے تعلق سے مدرسہ کو بد سے بدتر کلمات ناشائستہ سے یاد فرماتے رہے ــــ یہ واقعہ اپنی نوع کا جیسا بھی ہو، تاہم ہم اپنے برادران و عزیزان مدرسۃ الاصلاح کو مبارکباد دیتے ہیں کہ

[1] یعنی مدرسۃ الاصلاح کے قرب و جوار میں۔ [2] اشارہ ہے رسالہ الاصلاح مرحوم کے اجراء کی طرف جو ۱۹۳۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا [3] یعنی مولانا شبلی اور مولانا حمیدالدین اور مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں، ہمدردوں اور متوسلین کو۔

مخالفوں کے اس کھلے مظاہرہ میں انھوں نے صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان کے پاؤں تہذیب و متانت اور وقار و حکمت کے جادہ سے الگ نہیں ہوئے۔ دوسری بشارت اس میں یہ ہے کہ دشمنوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ لیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کے بازوؤں میں کتنا زور اور ہمارے سینوں میں مضبوطی کتنی ہے ....“ (معارف اگست ۳۶ء)

مدرسۃ الاصلاح کے متوسلین اور کارکنوں نے مولانا عبد الغنی صاحب کے اس نئے مدرسے کو جس کا محرک اگرچہ جیسا کہ سید صاحب کی اس تحریر سے صاف ظاہر ہے، مدرسۃ الاصلاح کی مخالفت تھا ایک دینی درس گاہ سمجھ کر کوئی مخالفت نہ کی بلکہ ان سے جس حد تک ممکن ہوتا ہے اس کی امداد و اعانت کرتے ہیں لیکن ان کے لئے اس سے زیادہ رنج و ملال کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ مدرسۃ الاصلاح کے ایسے برگزیدہ اور مقدس بانیوں کو کافر بنا دیا جائے جن میں سیرت النبیؐ اور الفاروق کا مصنف ہی نہیں وہ بھی تھا جو اس دور آخر میں قرآنی علوم و معارف کا سب سے زیادہ ادا شناس اور جس کا زہد و تقویٰ اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر خدا یاد آتا اور خیر القرون کے مسلمانوں کی تصویر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی تھی۔

ہم .... کے فاضل مضمون نگار سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا مدرستہ الاصلاح کا یہی وہ تزلزل تھا جس کی اصلاح کے لئے مولانا عبد الغنی سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے تھے؟

اس واقعہ میں مدرستہ الاصلاح کے متوسلین اور کارکنوں کا جرم اور تزلزل صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے مولانا عبد الغنی صاحب کی خواہش کے مطابق اپنے دو مقدس بزرگوں کو کافر تو خیر کیا سمجھتے ان سے تعلق و انتساب کو اپنے لئے ہمیشہ کی طرح اب بھی فخر سمجھتے رہے اور ان کے دستور و اصول اور مدرسہ کے اصل مقصود سے ذرا بھی منحرف ہونے کے لئے آمادہ نہ ہوئے بلکہ اپنے مزید اطمینان کے لئے انھوں نے غیر جانبدار علماء سے بھی اس معاملہ میں رہنمائی حاصل کی اور الحمد للہ کہ علماء حق کی ایک کثیر تعداد نے جن میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد بھی تھے مدرسہ کے کارکنوں کی پوری تائید اور مولانا عبد الغنی کی مخالفت کا سارا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس معاملہ کی تحقیق کے لئے دیوبند سے سرائے میر کا سفر بھی کیا اور تحقیق و تفتیش فرما کر نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے فتوائے تکفیر پر دستخط نہ کئے بلکہ اس کی پرزور مخالفت اور کارکنان مدرستہ الاصلاح کی پوری حوصلہ افزائی کی اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کی تائید سے مدرسے کو جو تقویت حاصل ہوئی اس کے لئے کارکنان مدرسہ ہمیشہ مولاناؒ کے ممنون رہے۔ لیکن یہ بات مولانا عبد الغنی صاحب کو اس درجہ ناگوار گذری کہ غالباً سیاسی اختلاف کے علاوہ اس بنا پر بھی وہ مولانا مدنیؒ سے خفا ہو گئے جس کا خود مضمون نگار کو بھی اعتراف ہے ”حضرت شیخ الاسلام سے ابتداء میں ایک مسئلہ پر خفا ہو گئے تھے اور عرصہ تک کنارہ کش رہے۔“

دوسری طرف کارکنان مدرستہ الاصلاح کی وضاحت اور صفائی کا یہ خوشگوار نتیجہ بھی نکلا کہ اکثر بزرگوں نے مولانا عبد الغنی مرحوم کے علی الرغم اپنے فتووں سے رجوع کر لیا۔

مدرسے کا ایک تزلزل جس کی اصلاح کے لئے مولانا عبد الغنی کو سینہ سپر ہونا پڑا تھا یہ تھا دوسرا تزلزل جس کو دفع کرنے کے لئے شاہ عبد الغنی کو دوسری مرتبہ سینہ سپر ہونا پڑا تھا۔ اب ذرا اس کی حقیقت اور نوعیت بھی دیکھ لیجئے:۔

۸ — ۱۰ سال پہلے جب جماعت اسلامی کے خلاف فتووں اور ہنگاموں کا ایک طوفان بپا تھا اور علماء کی ایک جماعت کو اس کے فسق و ضلالت ہی نہیں کفر تک پر اصرار تھا تو بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جماعت اسلامی کے کچھ افراد مدرستہ الاصلاح سے صرف اس حد تک وابستہ تھے کہ وہ وہاں تعلیم دیتے یا تعلیم حاصل کرتے تھے ورنہ ان لوگوں کا مدرسہ کے انتظامی معاملات یا پالیسی میں کوئی دخل نہ تھا۔ بھلا مولانا عبد الغنی صاحب اس زریں موقع کو کیوں ضائع کرتے۔ انھوں نے اسے بھی مدرستہ الاصلاح کی مخالفت کے لئے بہت غنیمت اور مناسب سمجھا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے کچھ افراد کی مدرسہ سے وابستگی کو سہارا بنا کر عام مسلمانوں کو اس سے برگشتہ کرنے کی جتنی جتنی تدابیر ممکن ہو سکتی تھیں سب کر ڈالیں۔ اپنے مدرسے کے سالانہ جلسوں میں مدرستہ الاصلاح کے

خلافِ اشتعال انگیز تقریریں کرائیں اور ایک فاضل مقرر نے تو اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی دھمکی بھی دی تھی۔ اسکے علاوہ ان جلسوں میں کارکنانِ مدرسہ کے حق میں جو کلماتِ خیر فرمائے گئے ان سے تہذیب و شرافت دونوں کو شرما جانا پڑا۔

اس دفعہ بھی مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں نے قوم و ملت کے سامنے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کی "اصلاح" کو اس لئے قبول نہ کیا کہ مدرسہ کا حقیقتاً جماعت اسلامی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور گو انھیں جماعت سے کامل اتفاق نہ تھا تاہم ان کے نزدیک اس کے عقائد و خیالات میں کفر تو درکنار کوئی فسق و ضلالت کی بات بھی نہ تھی بلکہ دستور جماعت کی جس دفعہ کو سب سے زیادہ قابل اعتراض بنایا جاتا تھا وہ ان کے نزدیک عین حق و صواب اور سلف صالحین کا مسلک و عقیدہ تھی۔ اس لئے مدرسے کے دستور کی تصریح کے مطابق اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں کی طرح اس جماعت کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں کارکنانِ مدرسہ نے کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ نیز جماعت اسلامی سے متعلق جو افراد اس وقت مدرسہ سے وابستہ تھے ان سے مدرسہ کو بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی اس لئے ان کے متعلق یہ اطمینان تھا کہ وہ مدرسہ کے مقصد اور تعلیمی نظریے سے متفق اور اس کے پروگرام اور اصول کے مطابق نہایت مستعدی اور ذمہ داری سے تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے بعض کے متعلق یہ خوش گمانی صحیح نہ نکلی اسی لئے ۸—۱۰ سال کے تجربہ اور مسلسل تنبیہ کے بعد مدرسہ کو جماعت کے بعض سرگرم کارکنوں کی خدمات سے افسوس کے ساتھ اس لئے دست کش ہو جانا پڑا کہ وہ مدرسہ کے اصول و مقصد بروئے کار لانے میں مفید و معاون ثابت نہ ہو سکے بلکہ یہاں تک اندازہ ہوا کہ وہ تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دینے کے بجائے تحریکی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور اس سرگرمی اور دلچسپی میں انھیں مدرسے کے مفاد کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی اس لئے خود ایک رکن جماعت کی جو مدرسہ کے نہایت مخلص اور جن کی نگرانی میں یہ لوگ تربیت حاصل کر رہے تھے ہدایت و ارشاد کے مطابق مدرسہ ان کی خدمات سے دستکش ہو گیا ورنہ اس جماعت کے عقائد و نظریات میں اب بھی کارکنانِ مدرسہ کے نزدیک کوئی خرابی نہ تھی مولانا کی "اصلاح" نہ قبول کرنے اور جماعت اسلامی کے فسق و کفر سے اتفاق نہ کرنے کے سلسلے میں مدرسے نے جو موقف اختیار کیا تھا اس پر مزید اطمینان اور شرح صدر کے لئے اس نے علماء حق سے بھی استصواب کیا اور الحمد للہ اس بار بھی ان کی ایک کثیر تعداد نے مدرسہ کی ہمنوائی اور اسکی پالیسی کی توثیق کی ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ اور جانشین مولانا ظفر احمد تھانوی رح کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر جن اساتذہ سے مدرسے کو بے تعلق کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی ان میں استاذ محترم مولانا اختر احسن صاحب مرحوم بھی تھے جو مولانا فراہی رح کے سب سے زیادہ محبوب اور لائق شاگرد اور مدرسے کے سب سے زیادہ مخلص اور بے لوث خادم تھے اور جو جماعت اسلامی میں ہونے کے باوجود بھی نہ تو اس کی ہر بات کی تائید کرتے تھے اور نہ اس کے مفاد کو کبھی مدرسے کے مفاد پر ترجیح دیتے تھے اور جن کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مدرسہ کے مقصد و مزاج اور مولانا فراہی رح کے اصول و نظریات کے سب سے زیادہ اداشناس تھے اور جن کی تمام زندگی ہی مدرسہ کی بے لوث خدمت میں گذری تھی اور جن کی تمام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مقصد مدرسۃ الاصلاح کو ترقی دینا اور اس کے معیار میں اضافہ کرنا تھا۔ کیا ایسے بے لوث اور مخلص خادم سے مدرسہ کو بے تعلق کر دینے سے اس کا تزلزل رفع اور اس کی اصلاح ہو جاتی یا اسکے تزلزل اور تنزل میں (اگر وہ واقعی تھا تو) اور اضافہ ہو جاتا۔

اس تفصیل کے بعد اب ناظرین خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا واقعی مدرسۃ الاصلاح کے قدم میں کبھی تزلزل پیدا ہوا تھا اور کیا واقعی وہ اپنے اصول و مقصد سے کبھی منحرف ہو گیا تھا

جو مولانا عبد الغنی صاحب کو اس کی اصلاح کے لئے سینہ سپر ہونے کی ضرورت پیش آتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مدرسہ نے مولانا کی اس اصلاح نما مخالفت کو قبول کر لیا ہوتا تو آج وہ اپنے اصول و مقصد اور طریقۂ کار سب سے دستبردار اور اپنے دو ایسے مقدس بانیوں کو جن سے انتساب و تعلق پر اسے ہمیشہ فخر رہا ہے اور رہے گا کافر تک سمجھ بیٹھا ہوتا۔ ہم کو سخت تعجب ہے کہ جب سنہ ۶۱ء کے بعد مولانا کا اس مدرسے سے کوئی تعلق ہی نہ رہ گیا تھا تو وہ کیوں اپنے مدرسے کی خامیوں اور کوتاہیوں کی (جن کی تفصیل اور پردہ دری مقصود نہیں) طرف کوئی توجہ نہ کرنے کے بجائے مدرسۃ الاصلاح کی فکر میں دبلے ہو رہے تھے۔

مولانا عبد الغنی صاحب اللہ کے جوار رحمت میں جا پہنچے اب انھیں کیا کہا جائے مگر ...... کے مضمون نگار نے جو بیہودہ مہمل اور بے تکی بات جسے بھلا دینا ہی بہتر تھا چھیڑی ہے تو نہایت دکھ اور قلق کے ساتھ یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ مولانا نے مدرسہ کی اصلاح کے حسین نام پر جو کچھ کیا اس میں اخلاص و نیک نیتی کبھی شامل نہیں تھی اس کا مقصد صرف مدرسۃ الاصلاح کی مخالفت اور استیصال تھا اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انھوں نے مدرسہ کی مخالفت کا جو نامناسب طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ ان کے مقام سے انتہائی فروتر اور حکیم الامت مولانا تھانوی ؒ کے عقیدت کیش اور خلیفہ کے تو کسی طرح بھی شایان شان نہ تھا۔ اللہ تعالےٰ ان کی ان لغزشوں کو معاف اور کارکنان مدرسۃ الاصلاح کو صبر و استقامت اور پوری دلجمعی کے ساتھ آئندہ بھی اپنے مقصد و نصب العین اور مولانا شبلی و مولانا حمید الدین رحمہما اللہ کے اصول و خاکہ کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تجلی

یہ تو ناظرین سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ دیوبند کے جس ماہنامے کا شکوہ اس مراسلے میں ہے اس کا نام حذف کر کے اس کی جگہ نقطے لگا دیئے گئے ہیں۔ یہ کام خود مراسلہ نگار نے نہیں کیا بلکہ ہم نے کیا۔ ہم نے اس لئے کیا کہ ہم نہیں چاہتے جس ماہنامے کے وجود سے اب تک فقط ہزار دو ہزار آدمی واقف ہوں اس کے نام کا تعارف تجلی کے وسیع حلقے میں دور دور تک پہنچ جائے۔ بظاہر یہ تنگدلی ہمارے مزاج و طبیعت کے خلاف ہے مگر اسے بادلِ ناخواستہ اختیار کرنا یوں پڑا ہے کہ اس ماہنامے کے لئے ذریعۂ شہرت بننا ہماری نگاہ میں تعاون علی الاثم کے مرادف ہوتا۔ گو اس کے کارپردازوں سے ہمارے ذاتی تعلقات برے نہیں ہیں لیکن ذاتی تعلقات کو حق و انصاف کے تقاضوں پر اثر انداز ہونے کی اجازت ہم نے کبھی نہیں دی نہ آئندہ دے سکتے ہیں۔

کیا اس ماہنامے میں فلمی اشتہارات چھپتے ہیں؟ کیا عریاں اور فحش لٹریچر کی اشاعت کرتا ہے؟ کیا اس میں دہریت یا زندقہ کی ہمنوائی کی جاتی ہے؟ —— جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بظاہر اتنا ہی مقدس ہے جتنا دیوبند کے کسی دینی ماہنامے کو ہونا چاہیئے۔ اگر کبھی اتفاق سے یہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے تو اس میں ہر عنوان بظاہر "ایمان افروز" اور "روح پرور" ہی نظر آیا ہے۔ عنوان کے نیچے جو کچھ ہو گا وہ بھی غالباً طاہر و مطہر ہی ہو گا۔ "غالباً" اسلئے کہ "یقیناً" صرف وہ ہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنھیں پڑھنے کی بھی توفیق میسر آئی ہو۔ پڑھنے کی توفیق ایسے ماہناموں کو عموماً وہی لوگ پاتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے صوفی یا نیم صوفی ہوں۔ ہم جیسا "کج ذوق" آوارہ خو اور غیر صوفی آدمی بھلا یہ توفیق کہاں سے پائے۔ پا بھی لے تو انھیں ہضم کرنا آسان نہیں۔

پھر آخر کیوں اس کا نام حذف کر جانے کی جسارت ہم نے کی؟ —— اس کا سیدھا سچا جواب یہ ہے کہ اس کے کارپردازوں نے حال ہی میں پھر ایک "قوم دشمن" "امن سوز" اور "فتنہ انگیز" کتاب چھاپی ہے جو ایک نیم مردہ فتنے اور مہلک نزاع کو نئے سرے سے زندہ و تابندہ کرنے کی مفید خدمت انجام دیتی ہے۔ "پھر" ہم نے اس لئے کہا کہ "حیاتِ اسلامی" کے رد میں تیسرے اور چوتھے درجے کی گمراہ کن کتابیں دیوبند سے پہلے بھی چھپتی رہی ہیں۔ پھر یہ اپنی قبروں میں جا سوئیں۔ اب یکایک مردے نے انگڑائی لی ہے اور

ایک کتاب کا اشتہار زور شور سے چل رہا ہے۔ ہم اگرچہ اس پر تنقید کر کے ماضی کی کہانی دہرانا نہیں چاہتے کیونکہ ہمیں یقین ہے یہ اپنی موت آپ مر جائے گی اور جماعتِ اسلامی کا کاروان آگے بڑھتا رہے گا۔ لیکن رنج بہرحال ہوتا ہے کہ ارادت و عقیدت کے ایک خاص حلقے میں وضع بنائے رکھنے کی خاطر دین و ملت کے عظیم مفادات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ الاستاذ المکرم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جماعت کی مخالفت شد و مد سے کی تھی تو کم سے کم یہ تو اطمینان تھا کہ وہ مخلص ہیں، گھٹیا مفادات سے بالاتر ہیں، نیک نیت ہیں لیکن اب جو لوگ غائب شدہ سانپ کی لکیر پیٹے چلے ہیں۔ وہ تو ایسے بھی نہیں کہ ان کے خلوص ہی پر اعتماد کیا جا سکے۔ وہ فقط ایک مجہول وضعداری کو نبھانے کی سعیٔ نامسعود کر رہے ہیں۔ ان کی مثال اس بگڑے نواب کی سی ہے جو کسی خاص خاندان سے فقط اس لئے دشمنی جاری رکھتا ہے کہ اس کے باپ دادا بھی اس خاندان سے لڑتے آئے تھے۔

بہرکیف ہماری نظر میں یہ ایک ہولناک قسم کا قومی جرم ہے کہ محض ذہنی جمناسٹک کا سہارا لے کر جماعت اسلامی کی مخالفت کا فتنہ پھر سے کھڑا کیا جائے اور بہ بانگی ہرزہ سراؤں کی طرح وہی اعتراضات بار بار رٹے جاتے رہیں جن کی ایک ایک بخیہ ماضی قریب میں اُدھیڑی جا چکی ہے۔ حالاتِ حاضرہ کی نزاکتوں سے لاپروائی اور بے شعوری کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو گی کہ قوم و ملت کی حقیقی مسائل اور واقعی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ اتحاد و مواخات کی فضا پیدا کرنے کے عوض افتراق و نزاع کے شعلوں کو ہوا دی جا رہی ہے اور خدمتِ اسلام کے نام پر اصلاً خدمتِ طاغوت انجام دی جا رہی ہے۔

ایک لطیفہ ضرور سنئے۔ لطیفے کی ذمہ داری گو کہ کاتب ہی کے سر جائے گی مگر سچائی کبھی کبھی بھول چوک کے غرفے سے بھی نظر آ ہی جاتی ہے۔ مذکورہ نام نہاد کتاب کے اشتہار کی عبارت ہے:۔

"ٹھیک اسی طرح مولانا ..... مدظلہ نے خود ان کی ہی کتابوں کے حوالے سے ناقابل اعتبار دلائل کے ساتھ اس تحریک کی اصولی اور تصنیفی کمزوریوں اور اسلامی مقتدرات وغیرہ کی غلط ترجمانی کی نشاندہی کی ہے۔"

ظاہر ہے "ناقابل اعتبار دلائل" کے الفاظ کاتب صاحب کے کمالِ فن کا نقش لطیف ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا بڑا صحیح تعارف کرا لیا ہے اور معتقدات کے عوض "مقتدرات" کا ارتقام اگرچہ کوئی غیر معمولی قصور نہیں لیکن یہ شاید قدرت نے نمونہ دکھایا ہے تحریف کے اس فن کا جو جماعت اسلامی کے مخالفین عموماً استعمال کرتے ہیں۔ کاتب بیچارے کا بس صرف الفاظ پر ہے لیکن علماء اور مصنفین کشورِ معانی کے سلطان ہیں وہ تحریف و ترمیم کا کھیل معانی میں کھیلتے ہیں اور ایسے ایسے مفاہیم دوسروں کی عبارتوں سے کھڑے کر لیتے ہیں کہ اسٹیج کے شعبدہ گر بھی دیکھیں تو دانتوں تلے انگلی دبا جائیں۔

مراسلہ آپ نے پڑھ لیا۔ کسی مرحوم کی کمزوریوں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ خود مراسلہ نگار نے بھی مولانا عبدالغنیؒ یا کسی اور بزرگ کی تحقیر و استخفاف کے مقصد سے قلم نہیں اٹھایا بلکہ جیسا کہ آپ کے سامنے ہے اس نے صرف اس کیچڑ کو دھونے کی کوشش کی ہے جس کے چھینٹے دیوبند کے فلاں ماہنامے نے اُچھالے تھے۔ ہمیں دارالعلوم دیوبند سے خصوصی محبت ہے لیکن اُن تمام مدارس سے بھی محبت ہے جو ملک کے مختلف گوشوں میں اپنے اپنے طرز میں خدمتِ دین کر رہے ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کو قریب سے دیکھنے کی سعادت تو ہمیں میسر نہیں لیکن قرائن و کوائف سے جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک اچھا مدرسہ ہے جس نے بعض صفِ اول کے اربابِ علم و فکر پیدا کر کے اپنی اہمیت و عظمت ثابت کر دی ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

ردِ بدعت

بدعت کیا ہے؟	مجلد	۳/-
ردِ بدعت	"	۱/۲۵
تحقیق مذاہب	"	۲/-
وجد و سماع	"	۱/-
خصائل مسلمین	"	۲/-
چالیس بدعتیں	غیر مجلد	-/۶۲
اسلامی عقیدے	"	-/۲۵
کفر و اسلام کی کسوٹی	"	-/۳۷
عقائد وہابیہ اور علمائے دیوبند	"	-/۷۵
وہابی کی پہچان		-/۲۴
تحریک وہابیت پر ایک نظر	"	-/۲۵
تجزیہ علماء اسلام کی نظر میں	"	-/۳۷
بلاغ المبین	"	۴/-

سوانح اور حالات

ہمارے پیغمبرؐ	غیر مجلد	۱/۲۵
حضرت عائشہ صدیقہؓ	"	-/۸۸
" فاطمہ زہرہ رضؓ	"	-/۷۵
" بلال رضؓ	"	-/۶۲
" ابو ایوب انصاریؓ	"	-/۶۰
" سید الشہداء حضرت حمزہؓ	"	-/۷۵
" معاویہ بن ابو سفیان رضؓ	"	۱/۵۰
" عمرو بن العاص رضؓ	"	۲/۲۵
مبارک بچے۔ مختلف بچوں کی سوانح اور حالات۔ جو بعد میں مشہور و معروف بن گئے		-/۷۵
امام طحاوی رحؒ		۱/-

مختلف موضوعات

کتاب الاخلاق	مجلد	۲/۵۰
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	مجلد	۴/۵۰
طوفان سے ساحل تک	"	۵/-
ہندوستانی مسلمان	"	۴/-
مقالات سیرت	"	۴/۵۰
البرامکہ یعنی وزراء کی سوانح	"	۱۲/-
شاہ جہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب	مجلد	۱۲/-
اصول تفسیر اردو	"	۲/-
تفسیر کبیر اردو از شاہ ولی اللہؒ	مجلد	۶/-
فیوض الحرمین	"	۴/۵۰
فلسفۂ دعا	"	۴/-
عبقات اردو (از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)	"	۱/۵۰
اسلام کیا ہے (از مولانا منظور نعمانی)	"	۲/-
دین و شریعت	"	۳/-
معارف الحدیث ہر دو حصہ	"	۱/۵۰
النبی الخاتمؐ (سید مناظر احسن گیلانی)		۳/۲۵
قرآن میں نظام زکوٰۃ (مفتی محمد شفیع)		۱/۵۰
ضبط ولادت (محمد تقی عثمانی)		۱/۵۰
جمہوریت اور مغربی تحریکیں		۳/۵۰
اسلامی نظم و نسق (بدر الدین ابن جماعہؒ)		۳/۵۰
کتاب الصلوٰۃ (امام احمد بن حنبلؒ)		۱/۵۰
انسانیت کے تقاضے (بلال عثمانی)		۲/۵۰
درویشی کیا ہے؟ (مقبول احمد)		۲/۲۵
قرآن کیا سکھاتا ہے (سلیم عبد اللہ)		۱/۷۵
سلاطین ہند کی علم پروری		۱/۵۰
ہوتی ہے سحر پیدا (بدنام رفیقی)		۲/-
ہمارے عائلی مسائل		۳/۷۵
معجزہ کیا ہے؟ (مولانا محمد طیب)		۱/۵۰
فلسفۂ عجم (ڈاکٹر اقبالؒ)		۴/-
مولانا مودودی اور تصوف (شیخ احمد)		-/۵۰
سچی باتیں (مولانا عبد الماجد دریابادی)		۳/۸۸
محکمات (علامہ عبید اللہ السعادی)		۲/۷۵
حقیقۃ الاسلام قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ		۲/-
حیات انورؒ علامہ انور شاہ کشمیری کی سوانح		۴/-
وصایا حصہ اول (مفتی عزیز الرحمٰن)		۲/۲۵

امام غزالیؒ کی چند کتابیں

اردو لباس میں

خلق مسلم		۵/-
کیمیائے سعادت	غیر مجلد	۱۴/-
الحکمۃ فی مخلوقات اللہ		۳/۲۵
تبلیغ دین		۴/۵۰
تقاریر امام غزالیؒ		۲/۲۵
منہاج العابدین		۶/-

مولانا ابو الکلام آزاد کی کتابیں

صدائے رفعت	۳/-
انسانیت موت کے دروازے پر	۳/۵۰
غبار خاطر	۵/-
انسان کی حیات صالحہ	۳/۵۰
تبرکاتِ آزادؒ	۶/۵۰
صدائے حق	۲/۲۵

ضروری نوٹ۔ ان چھ کتابوں کی مجموعی قیمت پورے چوبیس روپے ہوتی ہے لیکن ایک ساتھ طلب کرنے پر یہ سیٹ صرف بیس روپے میں پیش کر دیا جائے گا۔

مکتبہ تجلی دیوبند۔ یوپی

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

شاید ہی کوئی سینہ اس آرزو سے خالی ہو کہ اس کی شخصیت ذلّت و خواری کی نہیں عزت و اکرام کی مستحق قرار پائے۔

تاج پوشی اور کج کلاہی اسی آرزو کا ایک نتیجہ ہے تو بدن پر چیتھڑے لٹکا کر سونے چاندی پر پہرہ دینا بھی اسی آرزو کا ایک کرشمہ ہے۔ امام مالکؒ بن انسؓ بھی پہلی اور دوسری صدی کے ایک انسان ہی تھے جن کے سینے میں یہ آرزو ہوگی، لیکن کیسا نرالا تھا یہ شخص کہ اس نے اس تمنّا کو پورا کرنے کے لئے دولت کو ٹھکرایا اور شہرت سے دامن بچایا۔ اس کی یہ آرزو تو اسے علم دین کی بوریا نشین درسگاہوں میں کشاں کشاں لے گئی جہاں شخصیت بنانے کے لئے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کردینا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں سے باہر نکل کر آدمی خدا کی زمین پر سینہ پھلا کر اور سر اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ سر جھکائے اس آخرت کے خیال میں مستغرق نظر آتا ہے جسے نہ اس نے کبھی دیکھا نہ ہاتھ سے چھو سکا۔ دنیا اس انسان کے قدموں کو چومنے کے لئے بڑھتی ہے جس نے خدا بننے کے بجائے خدا کا بندہ بننا پسند کیا ہو۔ تاج و تخت کی فلک بوس بلندیوں سے شہنشاہ وجد کرتے ہوئے نیچے گرتے ہیں تاکہ اس کے قدموں کی ذرا سی دھول ان کی آنکھوں میں پڑ سکے۔ سونے چاندی سے لبریز خزانے اس حسرت میں تڑپتے ہیں کہ وہ اس انسان کی ایک نظر حاصل کرسکتے مگر جس کے دل میں خدا کا عشق سما گیا ہو وہ تو جدھر دیکھتا ہے اُدھر ہی خدا کا چہرہ ہے۔ سونے چاندی کی کھنک اور طوق و سلاسل کی جھنکار اس کی سجدہ ریزیوں کا رُخ بدلنے کی جتنی کوشش کرتی ہے اتنی ہی شدّت سے خدا کی یہ آواز اس کے کانوں میں رس اور اس کے سجدوں میں مٹھاس گھولتی رہتی ہے کہ اسی خاک سے ہم نے تمھیں پیدا کیا ——— اسی میں تمھیں لوٹا دیں گے اور پھر اسی میں سے تمھیں باہر نکال لائیں گے۔

اگر کسی کے دل میں یہ سکت ہی نہ رہی ہو کہ وہ ان حقیقتوں کا گداز محسوس کرسکے تو اس کو اپنی آنکھیں کھول کر امام مالکؒ جیسے انسانوں کو ایک نظر دیکھ لینا ہی کافی ہوگا ——— مالکؒ انسؓ کے بیٹے مالکؒ ——— محمد مصطفٰےؐ کے شیدائی مالکؒ ——— خدائے واحد کے پرستار ——— جن کی زندگی ان حقائق کا جیتا جاگتا روشن ثبوت تھی۔ ایک ثبوت جو نہ پرانا ہوا نہ کبھی جھٹلایا جاسکا۔ جو آج تک زمانے کی نظروں سے اوجھل نہ ہوسکا حالانکہ وقت کی تیز ترین آندھی کو گرد اڑاتے ہوئے بارہ سو سال بیت چکے ہیں۔

ہمیں آباؤ اجداد کے اس "لعل یمن" کو خدا نے مدینے کی کان زریں جگہ عطا فرمائی تھی ——— مدینے نے جیسے ان کے پورے وجود کو اپنے اندر جذب ہی کرلیا تھا۔ موسم حج میں خدا کی پکار کے سوا کوئی طاقت اور کوئی کشش ان کو مدینۃ الرسولؐ سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہ کرسکی۔ بڑے بڑے شاہی درباروں سے بلاوے بھی آئے ——— سونے چاندی کی مقناطیسی کشش نے بھی بڑے شوق سے بازو پھیلائے مگر ان کے مقابلہ میں اُسے اس مٹی سے کہیں زیادہ پیار تھا جس کے سینے پر سرکارؐ کے قدم پڑ چکے تھے۔ اس بستی کی پاک فضاؤں میں وہ ان آوازوں پر سدا گوش بر آواز رہتے تھے اور خدا نے کیا کہا اور

خدا کے رسولؐ نے کیا کہا ؟ —— یہاں سے تو ابھی ابھی ابن عمرؓ جیسے جلیل الشان صحابیوں کی دینی مجلسیں اٹھی تھیں جن کے علم کی روشنائی سچ مچ خونِ شہداء سے کچھ کم نہ تھی —— یہاں تو ابن عمرؓ سے تیس سال فیض یافتہ نافع قرآن وحدیث کا حلقہ لئے رہے تھے —— یہاں تو ربیعۃ الرائی جیسے علماء پیدا ہوئے تھے جن کی ماں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر وہ ساری رقم بیٹے کے علم دین پر لٹا دی تھی جو ان کا شوہر محاذِ جنگ پر جاتے ہوئے ان کی دال روٹی کے لئے بڑی احتیاط سے دے گیا تھا۔ یہی تھی وہ رنگ ونور کی وادی جہاں کتاب وسنت کے رنگ ونور سے ماحول رنگین اور سینے روشن تھے امام مالکؒ نے ایسے ہی ستر روشن سینوں سے مسجد نبوی کے ستون کے پاس قال اللہ اور قال الرسولؐ کی جاں نواز صدائیں سنی تھیں اور یقین ہو چکا تھا کہ مدینہ اس زمین کی جنت ہے اور علم دین وہ دولت ہے جو قبر میں بھی ساتھ جاتی ہے اور آخرت کے بازار میں اس کا سکہ چلتا ہے۔ اسی لئے علمی آستانوں پر دامن شوق پھیلائے وہ خوابوں کی اس حسین بستی میں تمام عمر فروکش رہے۔

جب ریگستان کا آتشیں سورج ٹھیک سر کے اوپر چمکتا ہوتا اور ریت کے ان گنت ذرّات ایک زبردست نور کی چنگاریاں بن جاتے تو امام مالکؒ کو اس طرح علم دین کی تلاش ہوتی جیسے تپتے ہوئے ریگستان میں سفر کرنے والے کو سائے کی تلاش ہوتی ہے۔ —— جس طرح کوئی پیاسا مسافر لق ودق ریگزار میں پانی کی ایک ایک بوند کے لئے مارا مارا پھرتا ہے ٹھیک یوں ہی امام صاحبؒ گھر سے بقیع تک کا طویل فاصلہ طے کر کے اپنے استاد نافعؒ کی خدمت میں افتاں وخیزاں پہنچتے —— کیسا سایہ اور کہاں کا قیلولہ —— انھیں تو استاد کی خدمت میں پہنچ کر کتاب وسنت کے اوراق میں اس آگ کے خوف سے پناہ ملتی محسوس ہوتی تھی جس کے ایک شعلے کو بھی احساسِ گناہ کے آنسو تو فرو کر سکتے ہیں ورنہ دنیا کے تمام سمندروں کا پانی اُنڈیل کر بھی اس کے ایک شعلے کو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ ایک اور فقیہ ابن ہرمز کے درس نے تو امام کو اس طرح جذب کر لیا تھا کہ انھیں یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ سورج کب نکلا اور کب چھپ گیا۔ سورج نکلتا تو انھیں وہیں دیکھتا اور اسی طرح دیکھتے دیکھتے چڑھتا ڈھلتا اور چھپ جاتا مگر علم دین کی والہانہ خوشہ چینی کرنے والے کو نہ گھر کی یاد ستاتی اور نہ ہی یہ خیال چونکاتا کہ وہ موت کی تیاریاں کرتے ہوئے یہ بے رحم حقیقت بھول ہی گیا ہے کہ جینے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ مگر میرے مولا! کتنی پیاری بھول تھی یہ بھی! —— اور کس قدر ڈراونی بھول ہے وہ بھول جہاں انسانوں کے نہ جانے کتنے انبوہ زندگی اور اس کی ناپائدار لذتوں کا وظیفہ جپتے ہوئے قبروں کے اندر چلے گئے۔

دوسروں کی علمی مجلسوں پر جان دینے والا جب رنج ودل میں چراغاں کر کے اٹھا تو پھر خود اس کی اپنی علمی مجلس دید نی تھی۔ اس دن دنیا کو پتہ چلا کہ امام صاحبؒ کے سینے میں بھی "دل" ہے! ایسا دل جو تزئین وآرائش کے لطیف وجمیل احساسات سے خالی نہیں —— لیکن ان احساسات کا رُخ آج بھی اس نے بس خدا اور آخرت ہی کی طرف موڑ دیا تھا۔ چنانچہ اللہ اور رسولؐ کے ذکر واذکار کی محفل اس ذوق وشوق سے سجائی گئی کہ نفاست، پاکیزگی اور سلیقے کا حسن منھ سے بول پڑا۔ مگر اس حسن وجمال میں دبدبہ اور شکوہ تھا، سطوت اور وقار تھا۔

تاریخ کے دریچے سے آج بھی اس مجلس پر نظر پڑ جاتی ہے تو خدا کی قسم شاہی درباروں کے سارے طمطراق ہیچ نظر آتے ہیں —— اور یہ سب کچھ اسی علم دین کے احترام کے لئے تھا جس کی آسمانی کتاب کو آج ہم نے بوسیدہ جزدانوں میں لپیٹ کر طاق میں رکھ دیا ہے اور حدیث رسولؐ سے تو کتنے ہی کان عمر بھر ناآشنا رہتے ہیں۔

مگر یہ ہماری نہیں —— ہم سوختہ سامانوں کی نہیں، امام مالکؒ کی علمی مجلس تھی جنھوں نے اس خزانے کو پانے کے لئے سالہا سال تک اپنے وجود کو ریگستان کی دھوپ اور دھول میں گھسیٹا تھا۔ آئیے ذرا اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔

پُر تکلف ترین فرش کا دیدہ زیب اہتمام —— شاندار قالینوں کے وسط میں اُبھری ہوئی خوبصورت "شہ نشین" جہاں کتاب وسنت کا صحرا نورد اس وقت بیٹھنا ضروری سمجھتا تھا جب صاحب معراجؐ کی حدیث کو املا کرانا ہوتا۔ عود وعنبر کی ایسی بوئی انگیز جس کی جاں نواز خوشبو کو ہزاروں دستی پنکھوں کی جنبش فضا میں پھیلاتی رہتی۔ کیا مجال ہے کہ فرش کے اوپر ایک تنکا پڑا ہوا رہ جائے۔ اور

امام مالکؒ کی محتاط نظر میں وہ اسی وقت مجھ نہ جائے — یہ مجلس — جہاں حیاتِ جاوداں کا ایک سانس لینے کی تڑپ میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے بہترین جگر پارے ہفتوں اور مہینوں کی مسافت طے کرکے آتے تھے — جب کمالِ شوق و ادب کے ساتھ امام مالکؒ کے انتظار میں سراپا نظر اور سراپا گوش ہوتی تو خود کو کتاب و سنت کے حضور میں پیش کرنے کے لئے امام صاحب سچ مچ ایسا اہتمام کرتے ہوتے جیسے کسی معمولی آدمی کو ہفت اقلیم کے شاہی دربار میں طلب کر لیا گیا ہو۔ املاءِ حدیث کے لئے کون ہے جو اس شخص کے باطنی اہتمام کا تصور کر سکے جو اس کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے روزانہ غسل کرنا یا کم از کم باوضو ہونا ضروری سمجھتا تھا پھر نفیس ترین پوشاک زیبِ تن ہوتی — بہترین خوشبو میں خود کو بسایا جاتا — سر کے بالوں کو قرینے سے سنوارا جاتا تب کہیں جاکر یہ شخص کتابِ الٰہی کے مقدس اوراق کو بڑے ادب و احترام سے چھوتا اور کتابِ الٰہی کی بے ریب ترجمانی کرنے والے ارشاداتِ رسولؐ کو زبان پر لاتا۔

جہاں میرِ مجلس کا عالم یہ ہو وہاں شرکائے مجلس کا حال کیا پوچھنا! یہی تو وہ مجلس تھی جہاں امام اعظمؒ کی عہد آفریں ہستی سر جھکائے خاموش اور سراپا گوش دیکھی گئی — جہاں امام شافعیؒ کتاب کا ورق اس احتیاط سے الٹتے تھے کہ اس کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی اس طرف چھائی ہوئی گہری خاموشی پر بارِ خاطر ہو سکتی ہے — جہاں مجلس کے باہر امڈتی ہوئی سواریوں اور اندر ٹھیرے ہوئے انسانی اژدحام سے گذر کر عربی کا ایک شاعر یوں پکار اٹھا تھا۔

"اگر امام جواب نہ دیتے تو ہیبت کے مارے دوبارہ پوچھا
نہ جاتا! جہاں سائل کی زبان میں اسی وقت حرکت ہو سکتی تھی
جب اس کا سر ادب سے جھک چکا ہو۔ یہ ادب کا وقار ہے —
یہ سلطانِ تقویٰ کا جاہ و جلال ہے۔ لوگ اس کے آگے
فرطِ ادب سے لرز اٹھتے ہیں حالانکہ وہ نہ تخت پر بیٹھا ہے اور
نہ تاجِ شاہی اس کے سر پر ہے — !"

لیکن یہ وقارِ ادب کی منزل بیٹھے بٹھائے نہیں آ گئی تھی — اس بلندی کو چھونے والے نے تلوار کی دھار پر چل کر دکھایا تھا۔ پاسِ حق میں شاہی مزاج سے ٹکراتے ہوئے اور موت اور زندگی کے خطروں سے گذر کر اس کفن بردوش امام نے علمی مجلس میں اس شان سے نشست لی تھی کہ شاہانِ وقت کو اپنی بے بضاعتی کا یقین آ گیا تھا۔ ہارون رشید جیسا کجکلاہ جس کے ایک اشارے پر علماء کے سر اترتے تھے جب مدینے آیا اور بطورِ اعزاز و اکرام یہ خواہش کی کہ امام مالکؒ اپنی کتاب "مؤطا" اس کے دربار میں آکر سنائیں حضرت امامؒ نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی مجلس میں قبلہ رو بیٹھے رہے اور ذرا پروا نہ کی کہ اتنا بڑا بادشاہ میرا منتظر ہے۔ ہارون رشید نے خفیف سا احتجاج کیا تو خدا سے ڈرنے والے نے پلٹ کر جواب دیا — "علم کے پاس لوگ آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا!" پھر ہارون رشید نے علمِ دین کے دروازے پر کھڑے ہو کر اتنی سی بات کہلائی کہ "اچھا — لیجئے میں خود ہی علم کے پاس آ پہنچا ہوں — لیکن ازراہِ کرم میری خاطر اتنی زحمت گوارا کر لیجئے کہ تھوڑی دیر کے لئے حاضرینِ مجلس کو باہر بھی بھیج دیجئے تاکہ میں آپ سے تنہائی میں آپ کی کتاب سن سکوں"۔ لیکن امام صاحبؒ کو اہلِ اقتدار سے ڈر کر اہلِ علم کی یہ توہین بھی گوارا نہ ہوئی۔ خوفزدہ ہونے کے بجائے برافروختگی کی شان آ گئی اور دو ٹوک جواب دے دیا — "نہیں کسی ایک شخص کے فائدے کے لئے مفادِ عامہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔"

موسمِ حج کے تاریخی موڑ پر امام صاحبؒ کو یہ علمِ دین کی ذمہ داری اتنی شدت سے محسوس ہوتی کہ احتیاط وہم اور جنون کی شکل اختیار کر لیتی۔ حالانکہ یہی وہ نازک وقت ہوتا جب داعی اور رعیت دونوں کی عقیدت ایک ایسے طوفانِ شوق کی صورت اختیار کر لیتی جہاں اپنی پوزیشن گر جانے کا تصور بھی بڑے سے بڑے انسان کو اپنی موت اور خودکشی نظر آنے لگے۔ اس زمانے میں جہاں ایک طرف کوفہ، بصرہ، خراسان اور عالمِ اسلام کے علمی مراکز کے چیدہ چیدہ اعاظمِ رجال شاگردانہ عاجزی کے ساتھ مجلسِ مالکؒ میں زانوئے تلمذ تہ کرتے — خلقِ خدا فرطِ شوق میں ٹوٹی پڑتی تو دوسری طرف ایوانِ شاہی سے یہ غلغلہ انگیز اعلان ہوتا کہ "اس نازک اجتماعی موقعہ پر امام مالکؒ اور ابن ابی ذئبؒ کے سوا کسی کو فتویٰ دینے کی اجازت نہیں"۔ لیکن امام کی نظر اس مدح و ذم کی دنیا پر کہاں، آخرت کی جواب دہی پر مرکوز رہتی — جس مسئلہ میں انھیں ذرا بھی شبہ ہوتا ہزاروں عقیدت مند

کے اس ہجوم میں کھڑے ہو کر صاف کہدیتے کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا اس کا صحیح جواب کیا ہے) شخصیت کا بھرم ٹوٹتا ہے تو سو بار ٹوٹ جائے۔ شاہی اعلانات کے یہ اعزاز ہمیشہ کیلئے ہاتھ سے جاتے ہوں تو چلے جائیں ــــ دور دراز کے عقیدتمندوں کی عقیدت اور حسن ظن سے عمر بھر کے لئے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے ــــ ان کے لئے یہ احساس کافی تھا کہ میرا ضمیر مطمئن اور میرا مولا مجھ سے راضی ہے۔ آزمائش کی وہ گھڑی اس سے بھی نازک ہوتی جب کسی مسئلے میں حق و باطل کا سوال کھڑا ہو جاتا وہاں تو حق کا اعلان کرتے ہوئے سمندروں کی طرح امنڈ پڑتے اور پہاڑوں کی طرح جم جاتے تھے ــ لیکن عزیمت کے اتنے بڑے مقام پر قدم رکھتے ہوئے بھی ان کو اپنی بڑائی کا احساس تک نہ ہوتا۔ یہاں بھی اعلائے حق کا صور اسرافیل ان عاجزانہ کلمات سے شروع ہوتا "ماشاء اللہ ــ لا حول ولا قوۃ الا باللہ ــــ یہ خدا کی دین ہے ورنہ وہ مدد نہ کرے تو بھلا میں کیا ہوں اور میری کیا حیثیت!

ایک بار ایک شخص نہایت دور دراز کا سفر کرکے خدمت میں حاضر ہوا اور کوئی ایسی بات پوچھی جس کے جواب کی طرف سے امام صاحب پوری طرح مطمئن نہ تھے۔

"میں نہیں جانتا" دور دراز کے اس عقیدتمند سے امام صاحبؒ نے بلا تکلف فرمادیا "میں اچھی طرح یہ بات جانتا نہیں ہوں ــ"

"جی؟!" سائل کو جیسے اپنے کانوں پر یقین کرنا مشکل ہوگیا "حضرت! میں چھ مہینے کا دشوار گذار سفر کرکے یہاں تک اسی مسئلے کے لئے پہنچا ہوں ــ"

"خدا تمہارا بھلا کرے" امام صاحبؒ نے بے نیازی اور قدرے ناگواری کے ساتھ فرمایا "میں اپنا بہترین جواب تمہیں دے چکا"

"اجی حضرت!" عقیدتمند نے فرط عقیدت میں ہاتھ پھیلائے "آخر میں اُن لوگوں کو کیا منھ دکھاؤں گا جنھوں نے بڑی توقع سے مجھے یہاں بھیجا ہے؟"

سائل کے الفاظ نے یہ بات کھول کر سامنے رکھدی تھی کہ ذرا سوچ لیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں ــــ اور یہ کہ آپ کا یہ جواب آپ کی شخصیت اور ہزاروں لوگوں کی عقیدت کو کہیں ملیامیٹ کرکے نہ رکھدے ــ ان الفاظ میں جذبات کی کسک نے قیامت کا اثر بھی پیدا کر دیا۔ مگر امام صاحب اس وقت بھی اپنی طرف نہیں کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ اس طرح بولے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو "جاکر کہدینا کہ مالک کہتا ہے میں یہ مسئلہ اچھی طرح نہیں جانتا"

سائل کی سٹی گم ہوگئی ــــ ایک شہرۂ آفاق امام کہہ رہا تھا کہ یہ مسئلہ میں نہیں جانتا! ــ مگر وہ خدا کا بندہ کیسا خوش تھا کہ خدا کی نظر میں اس کی دینی امامت کی لاج رہ گئی ــ علم کے احترام اور خوفِ آخرت میں اپنی شخصیت کو یوں خاک میں ملا دینا حضرت امام کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا' وہ اعترافِ جہل کرلیتے لیکن جس مسئلے میں غلطی کا شائبہ تک ہو وہاں خدا کی پکڑ کا خوف ان کے ہونٹوں کو سی دیتا تھا۔ یہ صورتِ حال کوئی ابن وہبؒ سے پوچھے جنھوں نے دنیا کو بتایا ہے کہ "اگر میں امامؒ کی "میں نہیں جانتا" نوٹ کرتا رہتا تو تختیاں کی تختیاں سیاہ ہوجاتیں!!" ایک بار کسی نے بڑے درد اور خلوص کے ساتھ امام صاحب کو یہ خطرہ محسوس کرانا چاہا کہ آپ کے اس طرزِ عمل سے لوگوں کو مایوسی ہو سکتی ہے امام صاحب کے سینے سے ٹھنڈی آہ نکلی اور اُخروی ذمہ داریوں کی یہ درد بھری کراہ ہونٹوں پر سنائی دی ــ "مصری مصر سے، شامی شام سے اور عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ آج مجھے جو بات معلوم ہے ممکن ہے کل اس سے بہتر کوئی بات معلوم ہوئی تو کیا ہوگا" بظاہر یہ ایک بات تھی جو کہی گئی۔ ــ مگر خدا جانے کہاں سے نکلی تھی یہ نوائے درد کہ سننے والوں کے دلوں کی لطیف نسیں جھنجھنا گئیں۔ امام مالکؒ نے تو سر جھکا لیا اور سامعین آستینوں میں منھ چھپا کر رو دیتے۔

"کیا ہوگا" کا یہی وہ معصومانہ خوف تھا جس کی قربانگاہ پر بڑے بڑے اعزاز بھینٹ چڑھ گئے۔ خلافتِ عباسیہ کا حکمراں منصورؒ امامؒ کا عقیدت کیش تھا۔ وہ پہلی بار حج کو آیا تو بھرے دربار میں امام صاحبؒ پر عقیدت کے پھول اس طرح لٹائے "میں فقہی اختلافات سے تنگ آچکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آنجناب کی "مؤطا" خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور اس کی نقول بلادِ

اسلامیہ کے چپے چپے تک پہنچا کر شاہی اعلان کر دیا جائے کہ اب ہر فتویٰ اسی کتاب کی روشنی میں دیا جائے گا۔"

کتنے بڑے اعزاز کی بشارت دی گئی تھی! — لیکن وہاں تو یہ سنکر بدن پر لرزہ طاری ہوگیا — منھ میں پانی آنے کا موقعہ تھا مگر آنکھوں میں آنسو بھر گئے — نفس کی آرزوؤں کو گدگدانے کے بجائے جیسے ضمیر وایمان کے سینے پر یہ پیشکش تیر بن کر لگی تھی۔

"نہیں۔ نہیں!" یہ اس آدمی کی چیخ تھی جو خزانوں پر کھڑا تھا مگر قبر کے اندر جھانک رہا تھا "نہیں نہیں — ایک شخص کی عقل رائے کو جو صواب وخطا دونوں کی زد میں ہے تمام مملکت پر ٹھونس دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

"آپ جائیں!" — منصور کے تاسف آمیز لہجے نے جیسے امام کے اندر جذبۂ تاسف کو چھیڑنا چاہا " ورنہ میں تو سنجیدگی سے یہ فیصلہ کر چکا تھا " مگر امام صاحب کو تو منصور کے نہیں خدا کے فیصلوں سے دلچسپی تھی۔ پیشکش رد کر دینے کے بعد کوئی ان کا چہرہ دیکھتا۔ جیسے کوئی پھانسی کے تختے سے جان بچاکر آرہا ہو! لیکن دوسری طرف خود منصور کے چہرے سے وہ عقیدت پھوٹ نکلی تھی جو انسان کو بیتاب کر دیتی ہے کہ بس قدموں میں گر جائے۔ کیسی عجیب ہے خدا کے عشق کی گلی بھی — یہاں بندہ جتنا کھوتا ہے اتنا ہی زیادہ پاتا ہے! یہاں بندہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کر کے جب آنکھ کھول کر دیکھتا ہے انتہائی غیرت مند خدا کی پذیرائیاں ہمیشہ آگے ہی آگے دکھائی دیتی ہیں۔ ہمیشہ آگے ہی آگے! — لیکن یہ حق کوشی اور حق پسندی کی گھاٹی تھی — جہاں پھول ہی نہیں کانٹے بھی ہیں۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ جہاں پھولوں کی بارش ہونے کے بجائے اہل حق کو کانٹوں کے ہار پہنائے جاتے اور سچائی کے جرم میں جی بھر کے ستایا جاتا ہے وہیں تو زخموں کے لہو کو دیکھ کر اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس خون میں للّٰہیت کا رچاؤ کتنا ہے؟ — یہاں آکر ہی یہ بات صاف ہوتی ہے کہ اپنی ضربتِ توحید سے دنیا کے سارے بت پاش پاش کر دینے والا خود اپنی ذات کا بت بھی توڑ چکا ہے کہ نہیں — اور اُف یہ بت! — سب سے خوبصورت اور سب سے خطرناک آخری بت — جو خدا جانے کتنی مقدس قباؤں کی آستینوں میں چھپا بیٹھا رہتا ہے اور توحید کے نجانے کتنے نام لیواؤں کے کفن میں قبر کے اندر ساتھ جاتا ہے!۔

امام موصوف کی زندگی میں بھی یہ معرکۂ حق و باطل پیش آنا تھا سو پیش آیا — یہ وہ نازک دور تھا جب سیاسی انقلاب نے خونیں ندی اور طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی — ایک زلزلہ تھا جس میں تاج و تخت اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ نئے تاجدار اُمویوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے تھے۔ جب ذرا سی بات پر سر کٹ جاتے تھے اور قبروں کی ہڈیاں بھی قبروں میں چین سے پڑی نہ رہتی تھیں — اور اسی خوف و دہشت کی فضا میں امام مالکؒ کو اعلائے کلمۃ الحق نے آواز دیدی واقعہ یوں پیش آیا کہ کسی نے اُن سے جبری طلاق کا مسئلہ دریافت کر لیا۔ امام صاحبؒ کی رائے تھی کہ جبر و زبردستی سے دلائی ہوئی طلاق طلاق نہیں ہے۔ لیکن اس وقت اس مسئلے کا یہ جواب دینا گویا نئے حکمرانوں کی جبریہ بیعت پر براہ راست ضرب لگا دینا تھا پھر اس وقت بیٹنے کی مسندِ اقتدار پر منصور جیسا عقیدت مند نہیں بلکہ اس کے عم زاد بھائی جعفر کی شخصیت تھی جو امام کیلئے اجنبی اور سیاسی مفادات کے تحفظ میں شمشیر بے نیام تھی۔ لیکن امام صاحبؒ نے نہ صرف یہ فتویٰ دیدیا بلکہ عباسیوں کے سیاسی حریف نفس ذکیہ کی حمایت کا اظہار کرنا بھی حق کا ایک بردست تقاضا سمجھا۔ اور جب لوگوں نے یہ عذر پیش کیا کہ "ہم منصور کی بیعت پر حلف اُٹھا چکے ہیں" تو امام صاحبؒ نے یہ کہہ کر اپنی جان ہی خطرے میں ڈالدی کہ "منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام بجبر کرایا جائے شریعت کی بارگاہ میں کیسر بے اعتبار ہے اس لئے کہ از روئے حدیث جبراً طلاق دلائی جائے تو طلاق ہی واقع نہ ہوگی۔" — اس اعلان کی زلزلہ انگیز آواز ابھی گونجنے نہ پائی تھی کہ جبریہ طلاق کا یہ مسئلہ حکومت کے نزدیک موت اور زندگی کا مسئلہ بن گیا چنانچہ جبینِ اقتدار پر ہولناک شکنیں نمودار ہوئیں۔ لیکن امام نے اپنے موقف میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی۔

تھوڑی سی مدت بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ایوانِ اقتدار سے حکم آپہنچا — "خاموش! بس آئندہ یہ آواز منھ سے نہ نکلنے پائے!" مگر امام مالکؒ اسی وقت جوش میں اُٹھے اور اسی اعلانِ حق کی تکرار سے قصرِ سیاست کے در و دیوار ہلا دیئے۔ سننے والوں کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے" اور امام کے چاہنے والوں کے

ہزاروں سینوں سے ایک ہی بیقرار ہوک نکلی " ہائے ہمارا امام مالک۔۔۔۔۔!" مگر امام مالکؒ کو اس وقت اپنا ہوش کہاں تھا۔ جان ہزار بار خطرے میں پڑ جائے مگر جانِ آفریں کے کام آجائے! اور حق کا پیغام خطرے میں نہ پڑنے پائے ادھر سے قانون کی ننگی تلوار امامِ وقت کی طرف بڑھ رہی تھی اور اُدھر سر پر کفن باندھے ہوئے حضرت امامؒ شریعت کے ایک مسئلے پر جان دینے تشریف لا رہے تھے ۔۔۔ جیسے بندگی کی اس آرزو نے آج زندگی کی ہر آرزو کو پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ سرِ نیاز کا آخری سجدہ تلوار کی دھار پر ہو۔ قدموں میں عزیمت کی وہ بجلی تڑپ رہی تھی جو پل صراط کو طے کرتے ہوئے سچے مومنوں کے قدموں میں نظر آ سکتی ہے ۔۔۔ آنکھوں میں آنسو نہیں غیرتِ حق کی سرخی تھی ۔۔۔ چہرے پر خوف نہیں ایک ایسے گہرے سکون و اطمینان کے آثار تھے جیسے کسی بندے کے سر پر خدا کا طاقتور اور رحمت بھرا ہاتھ رکھا ہوا ہو۔ ابتلاء کی نازک گھڑی سر پر آ چکی تھی ۔۔۔ مگر اس جواں ہمتی کے دہانے پر حضرت امام جتنے مطمئن تھے کسی نے کبھی مسندِ امامت پر بھی انھیں اتنا مطمئن نہ دیکھا تھا ۔۔۔ عقوبت کے خوفناک ہاتھ میں حرکت ہوتی اور غیظ و غضب کے بدترین انداز سے امامِ وقت کو برہنہ کیا گیا۔
اور ۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ کسی کو خبر نہیں ۔۔۔ زمین و آسمان نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں ۔۔۔ ستر کوڑوں کی شائیں شائیں کرتی ہوئی ایک لرزہ خیز آواز تھی جو ایک ننگی پیٹھ سے خون کے فوارے اُڑاتی فضا میں بلند ہوتی اور پتھر کے کلیجے منھ کو آجاتے ۔۔۔ مگر جس کے اوپر یہ قیامت گذر رہی تھی اس کی ایک کراہ بھی کسی نے نہ سنی ۔۔۔ ستر کوڑے اس بے رحمی سے برسے تھے کہ امامؒ کے دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اُتر گئے تھے مگر اس وقت بھی ان لرزتے ہوئے، ٹوٹتے ہوئے ہاتھوں میں کتاب و سنت کا وہی فیصلہ تھا جو مسندِ امامت سے جاری ہوا اور کوڑوں کی بوچھار میں دہرایا گیا تھا۔ حق کوشی کی یہ آزمائش ابھی ختم نہ ہوئی تھی ۔۔۔ زخموں اور چوٹوں سے لدے ہوئے اس جسم کو بے دردی سے اٹھا کر ایک اونٹ کی کمر پر ڈالا گیا تاکہ گلی گلی میں اس کی تشہیر کر کے اس شخصیت کو زندہ دفنا دیا جائے جس کو مار ڈالنے کی ہر کوشش اپنی موت خود ہی مر چکی تھی لیکن ٹھیک اس وقت جب آدمی رسوائی کے خوف سے دامن میں منھ چھپانے کو تڑپتا امام مالکؒ ۔۔۔ خون میں نہائے ہوئے ۔۔۔ دست و پا شکستہ امام مالکؒ اس یقین و احساس پر وجد کے عالم میں تھے کہ "ہے کوئی جو مجھے دیکھے! ۔۔۔ میں کہ خدا کی راہ میں ذلیل کیا جا رہا ہوں اور اسی لئے میری قسمت کی ہر ذلت ختم ہو چکی" ۔۔۔ وہ جدھر سے گذرتے یہ اعلان کرتے چلے گئے۔

" جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے ۔۔۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ہوں مالک ابن انس کا بیٹا ۔۔۔ اور میں یہ فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاقِ جبری سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔"

جس وقت یہ ابتلاء کا سلسلہ ختم ہوا امام کے ہزاروں چاہنے والے روتے روتے ہلکان ہو چکے تھے۔ مگر امام صاحبؒ اس وقت بھی نڈھال ہو کر بستر پر نہیں گرے، گرتے پڑتے سیدھے مسجدِ نبوی کی طرف جا رہے تھے تاکہ جس خدا کے لئے ان کو ستایا گیا تھا اسی کے قدموں میں گر کر شکر کے آنسو بہائیں ۔۔۔ نماز سے فارغ ہوئے تو بس اتنا کہا " سعید بن مسیبؒ کو کوڑے مارے گئے تھے تو انھوں نے بھی دو رکعت نماز شکر ادا کی تھی۔"

آئندہ سال جب حج کے لئے خود منصور آیا اور امام کی اس ابتلاء کا چشم دید حال سُنا تو خون کے آنسو روتا ہوا خدمت میں آیا اور کہا " میں نے حکم دیدیا ہے کہ اُس دشمنِ خدا (جعفر) کو ذلیل کر کے گدھے پر لادا جائے اور مدینے سے بغداد تک رسوا کر کے دُکھ بھری سزائیں دی جائیں۔"

" نہیں نہیں" امام مالکؒ بے چین ہو گئے " انتقام کی کوئی حاجت نہیں ۔۔۔ اُسے امیر المومنینؓ اور حضرتِ رسالت مآبؐ سے قرابت کی نسبت ہے۔ میں اُسے دل سے معاف کرتا ہوں۔"

سُنا آپ نے! ۔۔۔ یہ اس سفاک کے بارے میں کہا گیا تھا جس کی سفاکی نے امام پر مشقِ ستم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی ۔۔۔ اور کس نے کہا تھا ۔۔۔ اُس مظلوم نے جس کے جسم کی کھال ستر کوڑوں کی مار سے روئی کی طرح دُھنک دی گئی تھی۔

منصور نے یہ سُنا اور فرطِ عقیدت سے بیتاب ہو گیا۔ عقیدت کے جوش میں آواز لرز رہی تھی اور اس آواز سے یہ اعلان ہو رہا تھا کہ بہترین خلعتِ شاہی کو اس ہستی پر نچھاور کیا جائے ــــ حسبِ دستور ایسی خلعتِ فاخرہ کو شانوں پر ڈالنے کے لئے فی الفور حاجب آگے بڑھا۔ لیکن امام مالکؒ اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹے جیسے یہ خلعت نہیں غلاظت کی کوئی چھینٹ یا کانٹوں کا کوئی خوفناک ہار ہو۔ منصور کو امام کی نزاکتِ احساس کا فوری احساس ہوا اور حاجب کو ڈانٹتے ہوئے یہ حکم دیا "خبردار! ــــ اس خلعت کے لئے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ حضرت امام کے دروازے پر اس کو ڈال دیا جائے۔"

ــــ لیکن جب اس منصور نے اپنی بعض بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ علمائے وقت کو دربار میں بلا کر اپنے متعلق اچھی رائے حاصل کی جائے تو امام مالکؒ حق کا آخری اعلان کرنے کے لئے سر سے کفن باندھ کر نکلے۔ جوں ہی منصور نے مختلف علماء کی زبان سے اچھی رائے لینے کے بعد حضرت امامؒ کی طرف رُخ کیا۔ تو دیکھا کہ وہاں جھوٹ پر یوں پردہ ڈالے جانے کے خلاف شدید نفرت و بیزاری چہرے سے ٹپکی پڑ رہی ہے۔ احساسِ حق اور حق گوئی کی تڑپ نے آواز کو کربناک بنا دیا اور امام صاحبؒ نے کچھ نہ کہتے ہوئے اس طرح گویا سب کچھ کہہ دیا "لِلّٰہ! ــ مجھے اس کا جواب دینے سے معاف ہی رکھو!" خیریت ہی ہوئی کہ منصور امامؒ کے یہ تیور دیکھ کر سہم گیا اور اُن کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھ کر دوسرے امام ابن ابی ذئب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر وہاں سے اس سے بھی تلخ جواب ملا تو غیظ و غضب کے عالم میں تلوار سونت لی۔

"دیکھتے ہو؟" منصور نے بڑے ہی کڑے تیوروں سے ابن ابی ذئب کو گھورتے ہوئے تلوار دکھائی "دیکھتے ہو؟ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے؟"

"ہاں" تقویٰ اور عبودیت کی پُرسکون آواز میں جواب دیا گیا "ننگی تلوار دیکھتا ہوں ــــ لیکن ــ آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے" یہی تھے وہ لوگ جو آخرت کے لئے جیتے اور آخرت کیلئے مرتے تھے اور پھر بھی ان کی رُوح کو یہ سوچ کر قرار نہ آتا تھا کہ "جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی ــــ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

کسی نے امام صاحبؒ کی ہمشیرہ سے پوچھا کہ گھر سے باہر دن رات کا ایک ایک لمحہ اصلاح و افتاء میں کھپائے رکھنے والا تمہارا یہ بھائی گھر میں تو آرام کر لیتا ہوگا؟ ــــ عقیدت اور درد میں کپکپاتی ہوئی آواز آئی "جی ہاں ــــ گھر میں ان کے صرف دو کام ہیں ــ قرآن اور اس کی تلاوت!" وہ جمعہ کی ہر رات کو جیسے "شبِ قیامت" سمجھتے تھے ــــ اس رات میں ان کے پہلو کو بستر چھوتا ہی نہ تھا ــ تمام رات اُس صبح کے خوف میں روتے اور تڑپتے ہوئے گذرتی جس کا نام "فردائے قیامت" ہے اور جس کے بعد کوئی رات نہیں! ــ ٹھیک یہی حال ہر مہینہ کی پہلی رات کو ہوتا تھا۔

عشقِ رسولؐ کا عالم یہ تھا کہ ان کی ہر رات حضورؐ کی روحانی مجلس میں بسر ہوتی ــــ اور ہر شب میں زیارتِ رسولؐ سے خوابوں میں مشرف ہونے والا کسی دن یہ جرأت نہ کر سکا کہ اپنے بھرپور اصطبل کا کوئی جانور اپنی سواری کے لئے خاکِ مدینہ پر استعمال کرے! ــ حیاتِ دنیا کی وہ چیزیں جن کو خدا نے "دنیا کی زندگی کی پونجی" قرار دیا ہے اس شخص کی نظر میں جیسے مٹی ہو چکی تھیں جس کو ہر لمحہ یہ یقین اور انتظار تھا کہ عنقریب وہ خود مٹی میں مل جانے والا ہے ــــ ایک بار شاگردِ رشید امام شافعیؒ نے اصطبل کو دیکھا اور چند گھوڑوں کی تعریف خالی الذہن ہو کر کر دی ــ بس پھر کیا تھا ــــ سواریوں سے بھرا ہُوا یہ قیمتی اصطبل پورا کا پورا شاگرد کے حوالے کر دیا گیا اور متاعِ دنیا سے اس طرح ہاتھ جھاڑ کر اُٹھے جیسے کوئی بزبانِ خاموش کہہ رہا ہو کہ "خس کم ــــ جہاں پاک!" ــ ان کی دریا دل فیاضیوں کے خزانے سے صرف ان ہی امام شافعیؒ کو گیارہ ہزار دینار ہر سال عطا ہوتے تھے ــــ یہ تھے وہ لوگ جن کو نہ موت کا ڈر تھا نہ افلاس کا اندیشہ ــ حق یہ ہے کہ ایمان اور بزدلی کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے ــــ اگر شمشیر بکف حاجبوں کے خونخوار جتھے کو سجدے میں در آتا دیکھ کر ساری مجلس سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی مگر امام ابو حنیفہؒ نے پہلو تک نہ بدلا تھا تو امام مالکؒ کے موزے میں چھپے ہوئے ایک زہرناک بچھو نے ایک دو نہیں تقریباً ستّر بار کاٹا مگر حضرت امام محمدؐ اور رسولؐ کا جو ذکرِ جمیل چھیڑ چکے تھے اسے اس شان سے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اُٹھے کہ نہ چہرے کا رنگ تبدیل ہوا اور نہ پہلو بدلا۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد کہا کہ میرے موزے میں بچھو ہے ــــ جو میرے پاؤں میں مسلسل ڈنک مار رہا ہے

سننے والے تڑپ اُٹھے - موزہ اُتار اگیا تو بیچ مچ اس کے اندر سے بہت بڑا بچھو پھر پھراتا ہوا باہر نکلا مگر حضرت امام تھے کہ صبر و استقلال کی تصویر سے کھڑے تھے -

وہی مالکؒ بن انس جن کو جعفرؔ سلطان کے ستر کوڑے اور قانون کی ننگی تلواریں اپنے آگے نہ جھکا سکی تھیں ـــ جنھوں نے ہارون رشید کو ٹکا سا جواب دیدیا تھا کہ میری مجلس میں تیرے لئے کسی تخصیص کی کوئی گنجائش نہیں ـ وہ علم دین کے صحرا نوردوں کی دھول اسطرح آنکھوں پر ملتے ہیں کہ ایک بار امام ابو حنیفہؒ کو مجلس میں آتا ہوا دیکھتے ہیں تو ادب و احترام کی حد کر دیتے ہیں ـــ اپنی بیش قیمت مخصوص چادر ان کے لئے اپنے ہاتھ سے بچھا کر یہ خواہش کرتے ہیں کہ آپ اس پر قدم رنجہ فرمائیں ـــ پھر جب امام اعظمؒ واپس تشریف لے جاتے ہیں تو دیر تک دل ان میں ہی اٹکا رہتا ہے ـــ طرح طرح ان کی صلاحیتوں اور عظمتوں کے ذکر خیر تلامذہ سے کرتے رہتے ہیں افرماتے ہیں "تم نے دیکھا؟ ـــ یہ تھے عراق کے ابو حنیفہؒ! ـــ ابو حنیفہؒ! ـــ جو اس سامنے والے ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں!" ـــ یہ گویا اظہار و اعلان تھا اپنے ہم عصر ابو حنیفہؒ کی اُس خاص الخاص شانِ تفقہ اور قوتِ استدلال کا جس کی تابش و طلعت سے اُس وقت بھی علم و فراست کی فضا منوّر تھی اور آج بھی منوّر ہے ـ مخلص لوگ دوسروں کی خوبیوں پر پردے نہیں ڈالتے بلکہ ان کا اعتراف و اظہار کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتے ہیں ـ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا کہ صاف ستھری پوشش کے باب میں ان دونوں رفیع الشان اماموں کے طبعی میلان اور فکری زاویے میں بڑی یکسانی تھی ـ دونوں ہی من کے ساتھ تن کے بھی اُجلے تھے ـ دونوں ہی کا اندازِ نظر یہ تھا کہ ہمیں اپنی مقدرت کے مطابق بہتر سے بہتر لباس پہن کر تحدیثِ نعمت کا قرآنی مطالبہ پورا کرنا چاہیے ـ

امام مالکؒ کی زندگی کا یوں تو ہر گوشہ اور ہر لمحہ "مومن کی ایک نئی شان" تھا ـــ مگر جب سالہا سال تک خدا اور اس کے رسولؐ کو ـــــــ سے چاہنے کے بعد حضرت امام انسانوں سے دُور اور خدا کے پاس جا رہے تھے تو یہ منظر ان کی زندگی کا انتہائی رقّت انگیز منظر تھا! اُدھر تو یہ عالم تھا کہ مملکتِ اسلامیہ کی روشن ترین آنکھیں ان کے بالیں پر رشک اور عقیدت کی بڑھتی ہوئی تڑپ میں خون کے آنسو ٹپکا رہی تھیں کہ دنیا کتنے بڑے مومن، مجاہد اور فقیہ سے خالی ہوا چاہتی ہے ـــ لیکن خود اس مومن حنیف، مجاہد جلیل اور فقیہ اعظم پر احتسابِ آخرت کا وہ خوف طاری تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ـــ یہ نہ تھا کہ اس وقت اسے بڑے بڑے گناہ یاد آ کر تڑپا رہے ہوں ـــ یہ بھی نہ تھا کہ اس نے بندگی اور اطاعت میں کوئی کسر چھوڑ دی ہو ـــ بات صرف اتنی تھی کہ اسے یہ ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو فتاویٰ دیتے ہوئے کوئی غلطی انجانے میں سرزد ہو گئی ہو اور اُس کا مؤلا اُس سے مخاطب ہو! ـــ ہائے یہ واہمہ بھی اس نازک دل کا سکون لوٹ لینے کے لئے کافی تھا جس نے ایمان و یقین کی بے قراریوں میں اپنے اوپر دن کا چین اور راتوں کی میٹھی نیندیں حرام کر لی تھیں ـــ وہ اس وقت اس طرح اشکبار تھا جیسے خدا کے یہاں کوئی خالی ہاتھ جا رہا ہو تو عمر بھر کی غفلتوں نے گریہ و بکا کی شکل اختیار کر لی ہو ـ رخساروں پر بے سلسل لڑھکتے ہوئے قیمتی موتی ریش مبارک کے ایک ایک بال کو تر کر رہے تھے ـ سینہ ایک دبی ہوئی طوفانی ہُوک سے ہچکولے کھا رہا تھا ـ عقیدت اور صدمہ کے درمیان ہچکولے کھاتے ہوئے سیکڑوں دل تڑپ کر ہونٹوں پر آ گئے ـ "اے امام! ـــ آپ! ـــ آخر آپ اتنے کیوں رو رہے ہیں ـــ آپ کے تو سب کچھ" اور آوازیں یکایک ہچکیوں میں ٹوٹ گئیں ـــ ٹوٹ گئیں اور سینوں میں بیٹھ گئیں ـــ امام مالکؒ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کھول دی تھیں اور کس بے قراری کے ساتھ رو کر فرما رہے تھے "میں نہ روؤں تو کون روئے؟ ـــ اے کاش ـ ـ ـ ـ مجھ ـ ـ ـ ـ کو ـ ـ ـ ـ میرے ہر قیاسی فتوے ـ ـ ـ ـ کے بدلے ایک کوڑا مارا جاتا اور ـ ـ ـ ـ میں فتویٰ ـ ـ ـ ـ نہ ـ ـ ـ ـ دیتا!"

دھیرے دھیرے جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا مگر آنسوؤں کی روانی صاف بتا رہی تھی کہ سینے کی وہ آگ کچھ اور تیز ہو رہی ہے ـ نبض کی رفتار سست ہو رہی تھی مگر دل اور روح تھے کہ اسی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے ـ یہ خدا سے ڈرنے والے کا آخری

ڈرنا تھا — یہ رسول ؐ کو چاہنے والے کی آخری سپردگی تھی — اور پھر انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون کی کپکپاتی ہوئی آوازوں نے بتایا کہ خدا کا بندہ اپنے خدا سے جا ملا — شمع گل ہو چکی تھی مگر اس کی روشنی کچھ اور پھیل گئی تھی — انسان مر چکا تھا — مگر انسانیت کی رگوں میں ایک نئی زندگی دوڑ گیا تھا — خدا کی قسم! — یہ خدا کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا فرماتا ہے — ورنہ امام مالک ؒ جو مر کر بھی زندہ ہیں اسی دن ختم ہو جاتے جب ستر خونی آشام کوڑوں کی مار ان کی ننگی پیٹھ پر پڑی یا جس دن ان کے قدموں میں ایک مہلک عقرب نے اپنے زہر قاتل کے ستر ڈنک پیاپے اُتار ڈالے تھے —

— اور ایک ہم سوختہ ساماں ہیں کہ پھولوں کی سیج پر جیتے جی اپنے خدا کے لئے مر گئے اور اپنے رسول ؐ کے لئے پتھر ہو گئے اور کبھی یہ موت اور زندگی کا سوال ہماری نیندیں ایک رات کے لئے بھی حرام نہ کر سکا کہ "کیا ... ہم "مسلمان" ہیں؟" — اُف! دل یہ سوچ کر بیٹھا جاتا ہے اور زبان و قلم شل ہوئے جاتے ہیں — ۱۲

چند انگریزی کتابیں

SPIRIT AND MATTER RECONCILED	1/50
TENTS OF ISLAM	2/50
MARXISM OR ISLAM	5/-
TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM	3/-
MUSLIMS IN INDIA	6/-
ISLAMIC FAITH AND PRACTICE	4/-
INTRODUCTION TO ISLAM	5/-
HOW TO READ QURAN	1/-
THE INSTRUCTIVE TRANSLATION OF - - HOLY QURAN	2/-
MUSLIM UNREST IN CHINA	1/-

MAKTABA
TAJALLI
DEOBAND.U.P

ندوۃ العلماء — تعمیریات — لکھنؤ

تعمیریات۔ شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔
تعمیریات۔ پڑھنے والے کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرتا ہے۔
تعمیریات۔ اہل دل کے ایمان افروز حالات و ملفوظات پیش کرتا ہے۔
تعمیریات۔ جذبۂ ایمانی اور اسلام کی داعیانہ خصوصیات بخشتا ہے۔
تعمیریات۔ مسلمان ملکوں کے حالات و واقعات سے باخبر رکھتا ہے۔

مستقل عنوانات پر ایک نظر!

● قرآن کا پیام ● کلام خیر الانام ● ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی ● کتب خانہ کی سیر ● حضرتؐ دیار الٰہی کے سائے ● عالم اسلام ● دار العلوم (حالات و واقعات) ● نعت و نظم — آسان زبان، دلکش بیان، مفید معلومات، دیدہ زیب باتصویر سرورق!

سالانہ چندہ ۵ روپئے — خط و کتابت کا پتہ: منیجر تعمیریات، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — قیمت فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے

فتاویٰ عالمگیری

اردو زبان میں

ایک عظیم کتاب ——— ایک مبارک تحفہ

سلطنت مغلیہ کی علمی اور دینی تاریخی یادگار جسکی ترتیب وتدوین پر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے تیس لاکھ کا سرمایہ خرچ کیا اور ساٹھ علماء وفضلائے وقت نے جسکی ترتیب پر آٹھ سال تک عرق ریزی کی۔

دنیائے اسلام میں ہمیشہ سے مستند اور گرانقدر کتاب ——— زندگی کے تمام مسائل کا حل۔

جدید مسائل اور نئے تقاضوں کے پیش نظر بالکل تازہ فٹ نوٹس اور ضمیمے۔

"مسلم پرسنل لا" سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک قانونی دستاویز ——— ایک تاریخی ماخذ۔

جس کو

ایک علمی مجلس کی نگرانی میں صوری ومعنوی خوبیوں کیساتھ دوماہی سلسلہ کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے

ہدیۂ رکنیت

ہر قسط کی ضخامت تقریباً سو صفحات سائز ۲۲×۳۰/۸ (تجلی سائز) ہدیہ دو روپیہ چار آنہ (علاوہ محصولڈاک)

جو حضرات صرف ایک روپیہ ادا کرکے رکنیت قبول فرمائیں گے انکے لئے محصولڈاک معاف ہوگا اور انکی خدمت میں ہر قسط دو ماہ بعد مبلغ دو روپے ۲۵ پیسے کے وی پی کے ذریعہ روانہ کی جائے گی پہلی قسط مکمل کتاب الطہارت پر مشتمل ہے۔

آج ہی ممبر بن جائیے اور دوسروں کو ممبر بنائیے۔

مراسلت کا پتہ } مکتبہ تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

پاکستانی شائقین ایک روپیہ فیس ممبری اور سوا دو روپیہ قیمت ایک جزو ——— یعنی کل سوا تین روپے مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا پتہ "مکتبہ تجلی دیوبند" کو بھیجدیں۔ نیز آگے کیلئے ہر دوسرے مہینے ایک جزو کی قیمت سوا دو روپے بھیجدیا کریں۔ یا ایک سے زیادہ اجزا کی قیمت بھی وہ یک وقت بھیج سکتے ہیں۔ انھیں جزو ہمیشہ رجسٹری سے بھیجا جائے گا۔

پاکستانی پتہ :- مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار۔ پیر کالونی۔ کراچی

از:- محمد زین الدین علوی - احمد آباد

بریلوی فتنہ

• ذوالمجد والکرم مولانا عامر صاحب! سلام مسنون

بریلوی فتنہ گروں سے خیر و فلاح کی امید تو صرف وہی سادہ لوح عوام کرسکتے ہیں جو بدقسمتی سے عقل ایسی شئے لطیف سے معصوم و معرّا واقع ہوئے ہوں۔ ان کا خانہ ساز مذہب علمی بحث و مجادلہ کا متحمل ہے ہی نہیں اس لئے ان کے عقائد و مسائل پر بحث کرنا اپنے قیمتی اوقات کا ضائع کرنا ہی ہے۔

مگر پچھلے ۵-۶ ماہ سے ان لوگوں نے گجرات کی سرزمین کو اپنی جولانگاہ بنا کر فتنہ و شر کا جو بازار گرم کیا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ملک کے ذمہ دار علماء کرام اور مسلم ادارے اس جانب متوجہ ہوں اور حرب عقائد و افتراق بین المسلمین کی اس آگ سے مسلم عوام کو بچائیں۔ ورنہ حکومت کی نظروں میں نیز دیگر غیر مسلم اقوام کی نظروں میں اسلامیان ہند کا وقار پامال ہوگا صرف یہی نہیں بلکہ خود اسلام ایک مضحکہ خیز چیز بنکر رہ جائے گا۔

گجرات میں پچھلے تین سال سے محمد پالن حقانی نامی ایک معمولی مل مزدور رد بدعت کی زبردست تحریک لیکر اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے گجرات پر چھا گئے۔ حقانی صاحب نے معمولی سی اردو گجراتی کی تعلیم پائی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے اپنے دین کی وہ خدمت لی کہ بڑے بڑے متبحر علماء آج انگشت بدندان ہیں ان کی تقریر میں وہ جادو ہے کہ سنتے ہی انسان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ اس شخص کی تقریروں کی وجہ سے اب تک سیکڑوں بدکردار مسلمان تائب ہوکر پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے ہیں۔ ان کی تہجد بھی قضا نہیں ہوتی۔

قماربازی کے اڈے ویران ہو گئے ہیں' ہزاروں جوا کھیلنے والے اور شراب پینے والے مسلمانوں کی اصلاح ہو چکی ہے۔ عورتوں پر تو اس قدر رنگ چڑھا ہے کہ تمام محرمات ہی نہیں چھوٹی موٹی بدعتوں سے بھی تائب ہوکر تہجد تک نمازی بن گئی ہیں۔ چونکہ حقانی خود متقی اور بے لوث انسان ہیں اس لئے ان کی زبان میں بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب تاثیر رکھدی ہے۔ قرآن مجید کی ہزاروں آیتیں۔ پارہ' سورہ' رکوع اور آیت نمبر کے صحیح حوالوں کے ساتھ' نیز صحاح ستہ اور درمختار' عالمگیری عین الہدایہ' شرح وقایہ کی سیکڑوں احادیث اور فقہی مسائل انھیں ازبر ہیں اور وہ اپنی تقریر میں کتاب کا نام' جلد' باب اور صفحہ تک اسی طرح فقہی مسائل میں بھی پورے پورے حوالے دیکر اس طرح دین کی اصولی باتیں لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بدعتی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور خوبی کی بات یہ ہے کہ حقانی صاحب کا یہ سارا مطالعہ صرف اردو تراجم تک ہی محدود ہے۔ عربی' فارسی وہ جانتے نہیں ہیں۔ لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کیسے کیسے لوگوں سے کیسی کیسی خدمات لے رہا ہے یہ دیکھکر واقعی حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ یاد آجاتی ہے۔

جناب حقانی نے گجراتی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے' جس کا نام ہے "شریعت یا جہالت!" اس میں آیات کریمہ' احادیث نبوی ﷺ اور فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے صحیح اور مستند حوالوں کے ساتھ مروجہ بدعات اور غیر اسلامی عقائد کا اس طرح رد کیا ہے کہ بریلوی فرقہ کی بنائی ہوئی پوری کی پوری

عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ خدا نے اس کتاب کو قبول عام بھی ایسا عطا کیا کہ اس کا پہلا ۵ ہزار کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور اب دوسرے ایڈیشن کی تیاری ہو رہی ہے۔

حقانی صاحب کی اس اصلاحی تحریک سے برافروختہ ہو کر ملک کا پورا بدعتی گروہ اُن پر ٹوٹ پڑا ہے۔ بریلی، بدایوں، رام پور، کچھوچھہ، کانپور، بمبئی اور خدا جانے کہاں کہاں سے رضا خانی فرقے کے مولوی صاحبان گجرات میں دندنانے لگے۔ احمد آباد میں بھی بڑی ہڑبونگ مچائی۔ یہاں اس فرقے کا ایک مدرسہ "دار العلوم شاہ عالم" کے نام سے قائم ہے اس مدرسے والوں نے اب تک قوم کو خدا اور مذہب کے نام پر لوٹ کر ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ جمع کر لیا تھا اور پچھلے ۱۵ سال سے علماء حق کو گالیاں دے دے کر اور عوام کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے خوب کمائی کر رہے تھے ــــ جناب حقانی کے وعظوں نے اس نام نہاد دار العلوم کی چولیں بھی ڈھیلی کر دیں حالانکہ حقانی صاحب نے آج تک اس دار العلوم کا نام تک نہیں لیا۔ ان کی تقریر میں کسی کی غیبت، کسی پر طنز یا اعتراض سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نہ وہ چندہ کرتے ہیں نہ پیری مریدی کرتے ہیں۔ بے غرض اور بے لوث آدمی ہیں۔ غالباً انھی باتوں نے عوام کو زیادہ متأثر کیا اور لوگوں نے خود ہی اُس نام نہاد دار العلوم یا دار الفتنہ کو چندہ دینا یکسر بند کر دیا۔ چنانچہ اپنے بریلوی فرقے کے مولویوں کو اسی دار العلوم نے گجرات میں مدعو کیا جا بجا جلسے کروائے، بڑے بڑے اشتہارات، پوسٹر اور پمفلٹ شائع کرائے، جناب حقانی کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ـــ اور اس طرح قوم سے دینی تعلیم کے نام پر جمع کیا ہوا روپیہ اس "مولوی بازی" پر دل کھول کر خرچ کیا۔ اب تک تقریباً پچیس ہزار روپیہ یہ لوگ برباد کر چکے ہیں۔ جو بھی مولوی آتا ہے وہ چار سو، چھ سو روپیہ لیکر ہی جاتا ہے۔ جناب حقانی کے وعظ بند کرانے کیلئے اور ان کی کتاب کو توہین آمیز قرار دے کر ضبط کرانے کے لئے انھوں نے باقاعدہ ایک مہم چلائی۔

اس سلسلے میں .... کی تشریف بھی آئی تھی یہ حضرت کئی سال سے وقتاً فوقتاً احمد آباد آتے رہے ہیں اور ہر سال سیرت کے جلسوں اور جلوسوں، مناظروں کے نام پر یہاں سے مزدور حلقوں میں سے ۴-۵ ہزار روپے کا چندہ کرتے رہے ہیں۔ اب وہ کسی طرح ری پبلکن پارٹی اور جن سنگھ کے تعاون سے فیض آباد والے حلقے پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے ہیں۔ آپ نے احمد آباد آ کر شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جبل پور اور مالیگاؤں کے فرقہ وارانہ فساد میں جو مسلمان مارے گئے یا تباہ ہوئے ان پر اظہار افسوس کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سب دیوبندی عقائد کے وہابی تھے اس لئے اچھا ہی ہوا کہ ان کا خاتمہ ہو گیا۔ خس کم جہاں پاک! میں تو چاہتا ہوں کہ یہاں احمد آباد میں بھی ایسے دو چار فساد ہونے چاہئیں تاکہ یہاں کے تمام وہابی بھی لقمۂ اجل ہو جائیں ـــ"

ہمارے خیال میں ایسی تقریریں کر کر کے ہی انھوں نے جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کو خوش کیا تھا اور ہندوؤں کے ووٹ حاصل کر کے پارلیمنٹ میں پہنچے تھے ـــ آگے چل کر انھوں نے فرمایا:۔

"مولوی حسین احمد مدنی اور مولوی حفظ الرحمٰن دونوں ہی بد مذہب وہابی تھے۔ جب یہ دونوں مرے ہیں تو ان کی نعشیں سڑ گئی تھیں، یہاں تک کہ ان کی نعشیں برف میں دبا دبا کر رکھی جاتی تھیں پھر بھی اُن سے سخت تعفن اور بدبو اٹھ رہی تھی۔" (استغفر اللہ)

اور سنئے:۔

"حکومت نے جب مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ارادہ کیا اس وقت میں ہی دوڑ کر دہلی پہنچا اور حکومت کو اس فعل سے باز رکھا۔ ورنہ ڈاکٹر ذاکر حسین، حافظ ابراہیم وغیرہ سبھی اپنی اپنی کوششیں کر چکے تھے لیکن کسی کی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ میں نے اسے رکوایا اور پھر بمبئی جا کر مہاراشٹر اسمبلی میں تعدد ازدواج کے خلاف جو بل پیش ہوا تھا اسے ہوم منسٹر وغیرہ سے مل کر واپس کروا دیا۔"

پھر مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا:۔

"آپ احمد آباد میں اس جاہل حقانی دیہقانی کے وعظ کیوں ہونے دیتے ہیں؟ اس کے وعظ ہرگز نہ ہونے دیجئے۔ کسی بھی قیمت پر اور جس طرح بھی ممکن ہو اسے روکیئے، اگر اس سلسلے میں آپ گرفتار بھی ہو جائیں گے تو میں آپ کو چھڑا لوں گا میں پارلیمنٹ کا

ممبر ہوں، یہاں کے کلکٹر اور ڈی ایس پی ہمارے ادنیٰ نوکر ہیں میں جب چاہوں انھیں گھر بٹھوا سکتا ہوں ـــ"

ایسی اشتعال انگیز تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ جناب حقانی کے ایک جلسہ میں بریلوی غنڈوں نے پتھر بازی کی اور ہنگامہ برپا کیا۔ یہ لوگ جلسے سے الگ کھڑے ہوئے شور مچاتے تھے، گالیاں بکتے تھے، پتھر برساتے تھے، بجلی کے تار کاٹ دیئے، خواتین پر بھی سنگباری کی ـــ جلسہ میں سامعین کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ تھی، مگر جناب حقانی کی اپیل کی وجہ سے سارا مجمع صبر تحمل کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ تاآنکہ پولیس جب فسادیوں کو سمجھانے اور منتشر کرنے میں ناکام رہی تو آخر کار اُن پر لاٹھی چارج کیا، جس سے فسادی بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے ان کے تیرہ سرغنڈے پکڑ لئے جن پر اب فوجداری عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ پچھوچھوی صاحب یہ حال دیکھ کر اپنے متبعین کو چھڑانے کی بجائے خود ہی فرار ہو گئے۔

غرضیکہ اسی قسم کی ہڑبونگ پچھلے ۷ ماہ سے گجرات میں چل رہی ہے۔ بحالات موجودہ بڑودہ میں گجرات کے صفِ اوّل کے تمام متدین علماء، مسلم صحافی، وکلاء اور دیگر سربرآوردہ حضرات کا ایک اجتماع ہوا جس میں جناب حقانی کی کتاب کے بارے میں علماءِ گجرات نے فیصلہ دیا کہ یہ کتاب قطعاً صحیح اور حق بجانب ہے۔ اس کے تمام حوالجات صحیح اور معتبر ہیں۔ اس میں حضور اکرمؐ یا اور کسی کی توہین نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی ضبطی کے بارے میں جو لوگ شور و شغب برپا کر رہے ہیں وہ سوائے فریب کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس فیصلے پر علماءِ ڈابھیل، علماءِ راندیر، علماءِ سورت، علماءِ آنند، علماءِ بڑودہ، علماءِ احمد آباد، علماءِ وڈالی، علماءِ چھاپی اور گجرات کے تمام دارالعلوموں کے مہتمم صاحبان کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ فیصلہ حکومت گجرات کے ہوم منسٹر کے سامنے بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

لیکن بریلویوں کا شر و فساد ہنوز جاری ہے۔ حال ہی میں مورخہ ۲۱ – ۲۲ دسمبر کو ان لوگوں نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے نام سے دو جلسے کئے۔ جس میں یوپی اور سی پی کے کئی ایک پیشہ ور مولوی اور بنام نہاد سُنّی جمعیۃ العلماء کے صدر آل مصطفےٰ (بمبئی) نے بھی شرکت کی تھی۔ آل مصطفےٰ صاحب اور دیگر مولوی صاحبان کی آمد کا شہر میں کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ اگرچہ بڑے بڑے پوسٹر تبلیغ سیرت کے نام سے چسپاں کئے گئے تھے۔

اس جلسے میں سیرتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے سارا زور جناب حقانی اور ان کی کتاب پر ہی صرف کیا گیا۔ یہاں جو تبرّا بازی کی گئی ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ چونکہ جناب حقانی نے اپنی کتاب میں جا بجا تفسیر ابن کثیر کے حوالے بھی نقل کئے ہیں اس لئے مولوی آل مصطفےٰ نے اپنی پوری تقریر میں امام ابن کثیرؒ ہی کو گالیاں دیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

"ابن کثیر کے معنیٰ ہوتے ہیں "بہت سے باپوں کا بیٹا"۔ چنانچہ ابن کثیر کے متعدد باپ تھے اور خدا جانے اس کا اصلی باپ کون تھا ـــ!" (نعوذ باللہ)

ساتھ ہی امام ابن کثیرؒ کے استاد امام ابن تیمیہؒ کو تو (نعوذ باللہ) حرامی تک کہا۔ یعنی بجائے حرانی کے "ح"، "ر"، "ا"، "م"، "ی" کے ہجے کر کے حرامی کہا۔

اس طرح آل مصطفےٰ نے اپنی شیعی اور سبائی ذہنیت کا جو بظاہرہ کیا ہے اس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے اس واجب الاحترام مفسّر، محدّث اور مورخ کے خلاف ایسی بدزبانی کی جرأت تو شاید کسی غیر مسلم کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔

یہ لوگ اپنی بدباطنی اور خباثت کا جو زہر سادہ لوح مسلم عوام میں پھیلا رہے ہیں اس کے لئے کم از کم مسلمان اخبارات خصوصاً اُردو اخبارات ـــ کا یہ فرض ہے کہ مندرجہ بالا یا میں نام بہ نام شائع کریں تاکہ یوپی اور سی پی والوں کو بھی معلوم تو ہو کہ ان کے ملا قسم کے مولوی صاحبان گجرات میں جا جا کر کیا گل کھلاتے ہیں ـــ یہاں بحمد اللہ حقانی نے فضا اس طرح پلٹا ہے کہ اب ایسے پیشہ ور مولویوں کی کامیابی مشکل ہے تاہم یہ لوگ فتنہ و فساد تو برپا کرتے رہتے ہیں چونکہ یہ انکی سرشت ہے اسلئے نیش عقرب کا مقتضائے طبیعت رک نہیں سکتا مگر علماءِ حق کو بھی اب اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہئے۔ ۱۲۔

(بقیہ از صفحہ ۲۶)

کا سامان پیش کیا ہے منظومات کا بھی ایک ستھرا حصہ ہے۔
حسن انتخاب کو دیکھکر یہ محسوس ہوا کہ ادارۂ برادری کا مقصد خالص کاروباری نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد کی لگن اور ملت کا درد بھی ہے۔

سردار کے۔ ایم۔ پانیکر کا مقالہ "مسلمانوں کو غیر ملکی کہنا تاریخ کو جھٹلانا ہے"۔ ایک غیر مسلم کے قلم سے نکلا ہوا مسلمان مضمون "ہے۔ مگر کئی ایک دوسرے مضامین کی طرح یہ مضمون بھی" برادری "نے نقل کیا ہے۔ اچھا لا مانگے کا بھی ہو تو اُجالا ہے مگر اس سمت میں زیادہ بے تکلفی سے روشنی طبع کے گوشے دھندلا جاتے ہیں۔ مضامین اور نظمیں سب ہی قرینے کی ہیں۔ پہلی نعتیہ نظم بھی دل میں اتر سی گئی خصوصاً یہ دو شعر:۔

وہ شاہ بوریا مسند سکھایا جس نے دنیا کو
یہ انداز جہاں گیری یہ آئین جہانبانی
وہ عادل جسکی میزان عدالت میں برابر ہے
غبار مسکنت ہو یا شکوہ تاج سلطانی

بہرحال "تمبر" مطالعہ کی چیز ہے۔ آدھے روپے میں اتنے گوناگوں مزے! نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ مگر یہ مشورہ مضامین کے اعتبار سے ہے۔ کاغذ اور روشنائی کے لحاظ سے یہ قیمت کہاں تک مناسب ہے یہ اہل ادارہ جانیں!!

(۲)

جنوری ۶۲ء کا ماہانہ شمارہ سلام المرصدیقی کے جانے پہچانے قلم سے "حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان" کے نام سے ہے جس کو ادارے نے مجلد کتابی شکل میں بھی شائع کیا ہے چونکہ یہ کتاب باقاعدہ تاریخی حوالوں اور کتابیات سے مزین ہے اس لئے ان لوگوں کے لئے بھی "عقیدت افروز" ہے جو حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں ہلکے سے ہلکے "ظالمانہ" موقف سے اتنے ہی گھائل ہوتے ہیں جتنے خود حضرت علی رضؓ ابن ابی طالب کے سلسلے میں۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب مفید بلکہ شاید "عقیدت آموز" ہے جن کو اسلامی تاریخ کے سفاک رہزنوں نے "حب علی رضؓ" کی آڑ میں "بغض معاویہؓ" کی ان شعوری و غیر شعوری عدوں پر لا پٹکا ہے، جہاں حضرت معاویہؓ کی صحابیت کا انکار نہ کرنے کے باوجود ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" تک لکھنے اور کہنے سے جی چرایا جاتا ہے۔

اسلامی عظمتوں کی جس تاریخ پر سب لوگ بلا اختلاف فخر سے سر اٹھاتے ہیں ان کو اس قسم کی کتابوں کی طرف ایک نظر ڈال کر یہ ضرور معلوم کر لینا چاہئے کہ اس مایۂ ناز سرمایہ میں معاویہؓ کا خون جگر کس قدر شامل ہے توازن اور احتیاط کے لحاظ سے کتاب بے عیب ہے ——— الّا یہ کہ کہیں کہیں (جیسے صفحہ ۱۰۷) عربی عبارتیں تصحیح کی محتاج رہ گئیں یا جہاں امام ابوحنیفہ رحؒ کی یہ رائے دی گئی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو "باغی" سمجھنے کے خلاف تھے وہاں ان کے موقف کے سلسلے میں پوری بات دینی چاہئے تھی کہ ان کی رائے میں حق پر تو حضرت علی رضؓ ہی تھے مگر حضرت معاویہ رضؓ کا اجتہاد بھی ہرگز "بغاوت" نہ تھا ——— ایسے نازک مباحث میں لوگ ذرا سی بات سے نیک نیتی پر بدنیتی کا شبہ کرنے لگتے ہیں۔ اسلئے احتیاطاً یہ مشورہ دیا گیا اور اصولاً بھی یوں ہی ہونا چاہئے۔

کتاب قابل تعریف بھی ہے اور لائق سفارش بھی۔ کہ لوگ پڑھیں اور غلط گوشوں کو پڑھوائیں۔

(۳)

فروری ۶۲ء کا شمارہ علامہ شکیب ارسلان کی مشہور کاوش "اسباب زوال امت" کا ترجمہ ہے "برادری" نے اس کو شائع کر کے ہندی مسلمانوں کی بروقت خدمت کی ہے کہ ہندی مسلمان ذہنی افسردگی اور عملی جمود کا شکار ہیں اور یہ کتاب سراپا پیغام عمل ہے جس کو اس قرآنی حقیقت کا بھرپور شرح کہئے:۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کہیں کہیں جوش میں کچھ شدت جھلک گئی ہے مثلاً ایک قرآنی آیت کے ترجمہ کے بعد صفحہ ۴۲ پر لکھا ہے کہ:۔

اس جگہ علماء سے مراد وہ علماء ہیں جو مذکورہ بالا چیزوں یعنی پانی، نباتات، پہاڑوں، رنگ برنگ کے جانوروں اور ان کے اسرار کا علم اور واقفیت رکھتے ہیں نہ کہ

نماز اور روزے کے عالم"

یہاں بیچارے "نماز روزے کے عالم" کے ساتھ محض لفظ "صرف" آجاتا تو ان کی بھی آبرو رہ جاتی اور تنہا سائنس دانی میں بھی اتنا عالمانہ پن نہ پیدا ہوتا۔

کتاب بہر حال قیمتی ہے جس کی صحیح قیمت ہی یہ ہے کہ اس کو غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے اور کچھ کرنے کے کام کئے جائیں یہ علامہ شکیب ارسلان اُن علامہ سید جمال الدین افغانی کے معاصر ہیں جنہوں نے اسلام پر مسلمانوں کی جفائے و فا نما سے تنگ آکر یہ درد بھری آواز بلند کی تھی۔

"اے مسلمانو! یا تو اسلام کی سچی تصویر بن کر دکھاؤ
ورنہ پھر خدا کے لئے اسلام کے راستے سے ہٹ
جاؤ کہ تمہاری جیسی اور بدعملیوں کو دیکھ کر دوسری
قومیں اسلام کی طرف آنے سے رکی ہوئی ہیں"

اسلامی امتحانات

بنیادی اسلامی تعلیم کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا وجود ممکن نہیں

ہندوستان کے خاص حالات میں اسلامی امتحانات

اسلامی شعور کی بیداری کا ایک موثر ترین ذریعہ ہیں۔

اسلامی امتحانات میں شرکت سے :۔

- دین کا صحیح تصور • ایمان کی حرارت
- عمل کا جوش • دین پر ثابت قدم رہنے کا عزم
- دین کے لئے ہر طرح کی قربانی کا جذبہ

اور

- دین کو سربلند دیکھنے کا حوصلہ ابھرتا ہے۔

قواعد و نصاب مفت طلب فرمائیے

سکریٹری

ادارہ اسلامی امتحانات ۔ اچھا ورسا (بھوپال)

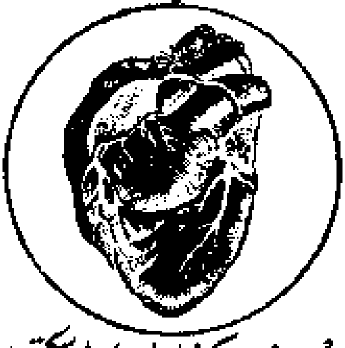

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے، خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کرکے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

ہمدرد

دہلی ۔ کانپور ۔ پٹنہ

نماز اور روزے کے عالم ''

یہاں بیچارے " نماز روزے کے عالم " کے ساتھ محض لفظ " صرف " آجاتا تو ان کی بھی آبرو رہ جاتی اور تنہا سائنس دانی میں بھی اتنا عالمانہ پن نہ پیدا ہوتا۔

کتاب بہرحال قیمتی ہے جس کی صحیح قیمت ہی یہ ہے کہ اس کو غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے اور کچھ کرنے کے کام کئے جائیں یہ علامہ شکیب ارسلان اُن علامہ سید جمال الدین افغانی کے معاصر ہیں جنہوں نے اسلام پر مسلمانوں کی جفائے وفا نما سے تنگ آکر یہ درد بھری آواز بلند کی تھی۔

" اے مسلمانو! یا تو اسلام کی سچی تصویر بن کر دکھاؤ
ورنہ پھر خدا کے لئے اسلام کے راستے سے ہٹ
جاؤ کہ تمہاری جیسی اور بدعملیوں کو دیکھ کر دوسری
قومیں اسلام کی طرف آنے سے رکی ہوئی ہیں "

اسلامی امتحانات

بنیادی اسلامی تعلیم کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا وجود ممکن نہیں

ھندوستان کے خاص حالات میں اسلامی امتحانات

اسلامی شعور کی بیداری کا ایک موثر ترین ذریعہ ہیں۔

اسلامی امتحانات میں شرکت سے :-

- دین کا صحیح تصور • ایمان کی حرارت
- عمل کا جوش • دین پر ثابت قدم رہنے کا عزم
- دین کے لئے ہر طرح کی قربانی کا جذبہ

اور

- دین کو سربلند دیکھنے کا حوصلہ ابھرتا ہے۔

قواعد و نصاب مفت طلب فرمائیے

سکریٹری

ادارہ اسلامی امتحانات ۔ اچھاور (بھوپال)

ڈر اور خوف کا
دل پر گہرا
اثر ہوتا
ہے

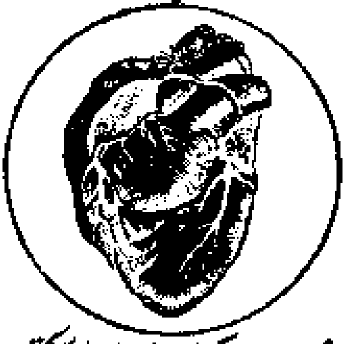

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے، خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

ہمدرد

دہلی — کانپور — پٹنہ

مستقل عنوان ملّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

ہمسرپاور کے قیامت خیز خراٹوں نے بمشکل بارہ بجے آنکھ لگنے دی تھی مگر پھر دو ہی گھنٹے بعد میری صبح طلوع ہوگئی۔ ہال کا کلاک ٹھیک دو بجا رہا تھا اور میرے ناخن پنجوں اور پیٹ ڈلیوں پر خراشیں ڈالنے میں مصروف تھے۔ آنکھ کھلنے کا باعث ہوسکتا ہے کھٹمل ہی رہے ہوں مگر نیم بیداری کے عالم میں ایک وحشت ناک قسم کی بڑبڑاہٹ بھی کانوں سے ٹکرائی تھی جس نے بچی نیند کی کوکھ میں گھونسا سا رسید کیا تھا۔ میں نے سر اُبھار کر آواز کی سمت دیکھا تو ہمسرپاور کے پیٹھے خاور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔ وہ دونوں گھٹنے پیٹ میں سکوڑے بظاہر تو سو ہی رہے تھے مگر ایک ہاتھ ہوا میں اس طرح لہرا رہا تھا جیسے دُور سے کسی کو ہدایات دے رہے ہوں۔ ہونٹوں سے بے معنی سی آوازیں نکل رہی تھیں — لیکن دوسرے ہی لمحے یہ آوازیں بامعنی الفاظ میں تبدیل ہوگئیں۔

ایکسیلینٹ بھنڈا ہے — بس دو چار چمچے اور — ونڈر فل۔۔۔غر۔۔۔غ۔۔۔غر — ٹے ٹے — کٹ۔ — لائٹ آف — مس وحیدہ رحمان — پلیز دونوں آنکھیں مت مارو"

ایک لحظہ خاموشی رہی۔ یہ لحظہ بڑا ڈرامائی تھا۔ ہال کی نیم روشن فضا میں ان کے الفاظ کی صدائے بازگشت کسی بے چین روح کی طرح پھڑپھڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ کلاک کی ٹک ٹک نے ماحول کو خاصا پُراسرار بھی بنا دیا تھا۔

وہ پھر یکایک چلّانے کے انداز میں بولے:-

"پیچ آؤٹ — ڈمام پیالے جیوجی بھر کے — کمپوڈیے ڈارلنگ سنجری مار — سنجری — سنجری — اِدا ہٹ — سوئچ آف کرو — فلیش لائٹ — ڈیر کیمرہ مین کلوز اپ مت"

گاڑی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ مگر بس ایک منٹ۔ دوسرے منٹ وہ پھر لہرا رہے تھے۔

"شاباش ٹنو کیٹے — سالے کیچ مت کرا لینا۔۔۔ ہیم۔۔۔ہا — دلیپ جانِ من تم نے تو مس گلبدن کے ہونٹوں سے ہونٹ بالکل ہی چیچ کر دیئے — یوں نہیں۔۔۔ یوں۔۔۔ بس اتنا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ ہونٹوں تک لائے مگر چیچ نہیں کیا۔ پھر ہونٹوں سے طویل سا بوسہ اُچھالا۔ اپنے ہاتھ کو ظاہر ہے انھوں نے ہیروئن ہی فرض کر لیا تھا۔

میری کھوپڑی چھت توڑ کر مریخ پر ترقی لگانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جی میں آئی وہ زناٹے دار گھونسہ رسید کروں پر خودداری کی ٹماٹر جیسی ناک پر کہ زندگی بھر ٹرکاتے کتے کی طرح بھونکتے پھریں مگر — اتنے ہی میں ایک دوسری بڑبڑاہٹ طلوع ہوئی۔ یہ غالباً — بلکہ یقیناً ان کے ڈیڈی بزرگوار اسٹارٹ لے رہے تھے۔

"شنا تم نے لیڈی فرفر — اپنے چھاگلہ صاحب نے بھٹو کے پیچھے اڑا دیئے — مسلم لیگ مردہ باد — ہی ہی ہی۔۔۔ ۔۔۔خو۔۔۔خو۔۔۔"

کروٹ بدلتے ہوئے وہ بڑے دردیلے انداز میں کراہے — پھر نئے جوش سے بولے:-

"پاکستانی غنڈہ چو این لائی۔ سارے جہاں سے اچھا بھارت نشاں ہمارا۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم گلستاں ہیں اُس کی۔۔۔ وہ

"۔۔۔ وہ بلبلاں ہمارا۔۔۔ را۔۔۔ ٹا لگا نیکا۔۔۔"

یہ نرالے قسم کے باپ بیٹے تین ہی دن میں میرے لئے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔ ایسا مسئلہ جو مسئلہ کشمیر کی طرح زلف در زلف تھا۔ عام حالات میں یہ میرے لئے بہترین تفریح ثابت ہوتے لیکن موجودہ حالات میں ان کے ضخیم وجود میرے لئے کباب کی ہڈی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے ۔۔۔ موجودہ حالات سے مراد یہ ہے کہ یہاں میر تجمّل حسین کی کوٹھی پر میں ان کی بڑی دختر کی شادی میں شریک ہونے آیا تھا ۔۔۔ بعض حالات ایسے پیش آئے کہ یہ شادی ایک ہفتہ مؤخر ہو گئی اور میر صاحب نے کسی قبلہ مارشل کے انداز میں آرڈر جاری فرمایا کہ میرا کوئی بھی مہمان شادی میں شرکت کئے بغیر نہیں جائے گا۔ کچھ مہمان تو لوٹ کر آنے کا وعدہ کر کے چلے ہی گئے مگر زیادہ تر ٹھیر گئے اور ان زیادہ تر میں ناچیز بھی تھا۔ میر صاحب نے ہم سب کے لئے کئی طرح کی تفریحات مہیا کیں۔ شطرنج۔ تاش۔ کیرم۔ وسیع و عریض لان میں میزیں کرسیاں ڈلوا دی گئیں۔ ناشتے اور کھانے تو شاندار تھے ہی مگر میرے لئے سب سے بڑی تفریح واجدہ تھی۔ گلاب کی طرح تر و تازہ اور شاداب ۔۔۔ چاندنی کی طرح دل کش ۔۔۔ یہ میر صاحب کی منجھلی لڑکی تھی۔ صورت سیرت دونوں میں طاق۔ شادی اس کی بڑی بہن ساجدہ کی تھی۔ میرا بس چلتا تو اتفاقیہ ہاتھ آئے ہوئے اس ایک ہفتے کو ایک صدی میں تبدیل کر دیتا۔

پردے کا چلن میر صاحب کے یہاں برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ پھر اس وقت تو سارے ہی مہمان ایسے احباب و اعزا پر مشتمل تھے کہ پردہ کجا کسی تکلف کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کئی مہذب خواتین تک مردوں کے شریک تفریح تھیں۔ حاصل یہ کہ اونچے کمپاؤنڈ سے گھری ہوئی اس عالیشان کوٹھی میں ہم سارے مفت خورے طویل المدت پکنک منانے جمع ہو گئے تھے۔

مگر یہ دونوں باپ بیٹے ۔۔۔ خدا کی پناہ ۔۔۔ یہ ہر لحاظ سے عجیب تھے۔ باپ تو ہر وقت سیاست کی بھول بھلیاں میں چکراتا پھرتا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بوریت کی آخری حدوں تک کھینچ لے جاتا لیکن بیٹا سیاست سے چڑنے کی حد تک بیزار تھا ۔۔۔ وہ تو فقط دو چیزوں کا رسیا تھا۔ کرکٹ اور فلم۔ اس کی باتیں سنکر بس ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے زمین گائے کے سینگوں پر نہیں بلکہ کرکٹ اور فلم کے دو خیالی ستونوں پر ٹھیری ہوئی ہے۔

پھر ان کا باہمی تعلق بھی عجیب نوع کا تھا۔ مثلاً باہمی گفتگو کا اسٹائل کچھ ایسا ہوتا۔

"دیکھ لینا پاکستان سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گا ۔۔۔" وہ بظاہر مجھ سے لیکن حقیقتہً سارے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتے ۔۔۔ "روتے روتے مٹی پلید ہو جائے گی حرام زادے کی۔"

میں مجبوراً بولتا ۔۔۔ "جی ہاں کیوں نہیں روئے گا ۔۔۔ اس کا تو باپ بھی روئے گا۔"

دفعتاً صاحبزادے بول پڑتے۔

"روئے گا کیا ۔۔۔ ڈیڈی یوں کہئے رو رہا ہے ۔۔۔ پہلی ہی اننگ میں جان من کو تارے نظر آ گئے ۔۔۔ پکوڑے کی بیٹنگ۔۔۔"

"بکواس بند کرو" ڈیڈی دہاڑتے "میں ہزار بار کہہ چکا ہوں کرکٹ کی بات میرے سامنے مت کیا کرو۔"

"پھر آپ بھی تو سیاست پر بور کرتے ہیں ڈیڈی ۔۔۔ میں سیاست کو اک دم بکواس ثابت کر سکتا ہوں۔"

"ثابت کیجے ۔۔۔ میں تمھیں بُری طرح پیٹوں گا ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ آپ یہ بھی نہیں کر سکتے ڈیڈی ۔۔۔ آپ نے کبھی کوئی کام بُری طرح نہیں کیا ۔۔۔"

ڈیڈی اس پر آگ بگولا نہیں ہوتے بلکہ ایسا منہ سا منہ بناتے جیسے بیٹے کے ٹوکنے پر سچ مچ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو

"خیر خیر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ ۔۔۔ میں ٹموکٹے اور ٹمم جیسے نام سننا برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔"

"ٹمم نہیں سوپر ڈیڈی ۔۔۔ ٹمٹم۔۔۔ چرونٹے کا بھائی جس نے پچھلے ٹیسٹ میچ میں ریاضت علی کی ٹانگ توڑ دی تھی ۔۔۔"

"مجھے تمھاری ٹانگ توڑنی پڑے گی ڈرٹی بوائے۔"

"تو پھر میں اچھے اچھے نام لوں ڈیڈی ۔۔۔ نرگس ۔۔۔ وحیدہ رحمان ۔۔۔ وجینتی مالا ۔۔۔"

"اب سچ مچ تیری شامت آئی ہے خاور کے بچے ——"
ڈیڈی حلق پھاڑتے۔

"اسٹاپ ڈیڈی — خاور کا نہیں آپ کا بچہ — اچھا آپ ہی بتائیے کرکٹ آپ کو پسند نہیں۔ فلم کا آرٹ آپ کو کاٹنے دوڑتا ہے — پھر بھلا دنیا میں کوئی کیا کرے۔"

حاضرین کے قہقہے ابل پڑتے۔ واجدہ بھی ہنستی۔ مجھے بھی ہنسنا ہی چاہئے تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے کچھ الجھن سی ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے یہ سب ڈرامہ ہو۔ الکدم غیر فطری ہو۔ اسی لئے میری ہنسی میں کھسیانے پن کا سا انداز ہوتا۔

بہرحال یہ تھا نادر اسٹائل ان باپ بیٹوں کا — چلئے میرا ہی کیا حرج تھا وہ بلبل تیتر کے مُرغوں کی طرح جھک مارے جائیں میرا کیا بگڑتا ہے مگر مشکل تو یہ تھی کہ انھیں نظر انداز کرنے کی بھی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔

قیام کے اگلے ہی روز میں اور واجدہ کوٹھی کے لان میں آتے ہوئے جاڑے کی خوشگوار دھوپ کا لطف اٹھا رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر تین بہانوں نے شطرنج جما رکھی تھی بیڑی ورانڈے میں تاش کھیل رہا تھا۔

پہلے ہمارے درمیان چھ سال پہلے کی باتیں ہوتی رہیں جب واجدہ گیارہ سال کی تھی سے گزر یا تھی اور کسی تازہ فلم کی کہانی بڑی تفصیل سے مجھے سناتے ہوئے اچانک پوچھ بیٹھی تھی کہ بھائی جان کیا میں بھی کسی پکچر میں کام کر سکتی ہوں۔

اس گفتگو کے دوران وہ بار بار کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ پھر گفتگو کا رُخ آغا حشر اور شکسپیر کی تمثیلی ذہانتوں میں نفسیاتی مماثلت کی طرف مڑا۔ میں نے بلا سے ان دونوں ہی کا ایک بھی ڈرامہ نہ پڑھا ہو لیکن اس بھولی بھالی لڑکی کو یہ باور کرا دینا کیا مشکل تھا کہ ان کے فن کا مجھ سے بڑا نبض شناس آج تک کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس غریب نے اسکول میں ان دونوں کا برائے نام سا تذکرہ پڑھا ضرور ہوگا مگر بھلا وہ میری خداداد معلومات کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔

"اوہ بیبی تم یہاں ہو — آج کا اخبار مجھے نہیں مل سکا۔" دفعتاً سریاور سر پر آ پہنچے تھے اور پھر بڑے اطمینان سے پاس والی لان چیئر پر بیٹھ کر پھولا ہوا سانس درست کرنے لگے تھے۔

"چچا جان وہ تو ریڈنگ روم ہی میں ہوگا۔" واجدہ نے کہا۔

"نہیں ہے۔ جاؤ تم ڈھونڈ لاؤ۔"

واجدہ بادلِ ناخواستہ اٹھ گئی۔ سریاور کی نظریں اب میرے چہرے پر جمی تھیں اور تیور ایسے ہی تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ ملّا بدبخت کو کدھر سے کھاؤں۔

"کیوں برخوردار — تم کیا مسلم لیگ میں بھی رہ چکے ہو۔" انھوں نے دفعتاً سوال کیا۔

"میں پیٹ لیگ کے سوا کسی لیگ کا نام تک نہیں جانتا سویر انکل۔"

"مگر تمھاری ٹوپی ……"

"اوہ یہ میری نہیں ہے انکل — یہ میری بیوی کی ہے وہ شادی والے دن اوڑھ کر آئی تھی —"

ظاہر ہے اس گھٹیا سے تمسخر پر انھیں جھلّا جانا چاہئے تھا — مقصد بھی یہی تھا کہ وہ تاؤ کھا کر بھاگ جائیں۔ مگر وہ تو بڑی معصوم سی حیرت کے ساتھ بولے۔

"بائی گاڈ — تو کیا تمھاری طرف عورتیں بھی ٹوپی پہنتی ہیں؟"

"بالکل پہنتی ہیں — جناب — مگر سن سینتالیس کے بعد سے گاندھی کیپ کا رواج چل نکلا ہے۔ ہمارے شہر میں آپ کو جمپر اور اسکرٹ تک پر گاندھی کیپ نظر آسکے گی۔"

یہ کہتے ہوئے میری نظریں ان کی ایک انگل چوڑی گاندھی کیپ پر تھیں جو سوٹ اور ٹائی پر عجیب بہار دے رہی تھی۔ توقع تھی کہ وہ طنز کا جواب کسی کھولتے ہوئے فقرے سے دیں گے مگر وہ تو خوش ہو کر بولے:۔

"ایکسیلینٹ — یہ تبدیلی برخوردار — سیاسی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے — ہم نے تو سنا تھا کہ دیوبند میں صرف مولوی لوگ رہتے ہیں۔"

"غلط نہیں سنا تھا — وہاں کی عورتیں بھی مولوی

ہی ہیں ۔"

"کیا!" وہ اُچھل پڑے "عورتیں مولوی ۔۔۔ ناممکن ۔۔۔ عورتیں بھلا مولوی کیسے ہو سکتی ہیں ۔"

"کیوں اس میں کیا خرابی ہے؟" میں نے ڈٹ کر پوچھا۔

"ہی ۔۔ ہی ۔۔ ہی ۔ میاں داڑھی کے بغیر کہیں مولوی ہوتا ہے ۔۔۔ تم مذاقیہ معلوم ہوتے ہو صاحبزادے ۔"

"نہیں ۔۔۔ سر یاور ۔۔۔ وہاں عورتوں نے بھی داڑھی لگانی شروع کر دی ہے ۔۔۔"

"او خدا ۔۔۔ کیا منظر ہوتا ہوگا ۔۔۔ جمپر اور داڑھی ۔۔۔ اسکرٹ اور داڑھی ۔۔۔ بائی گارڈ ۔"

اتنے میں واجدہ اخبار لے آئی ۔ اب میں سمجھا تھا وہ اخبار لے کر چلے جائیں گے مگر انھوں نے تو وہیں مطالعہ شروع کر دیا اور ابھی ہم دونوں یہاں سے کھسک جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ سوال کر بیٹھے ۔

"صاحب زادے ۔۔۔ ٹنگا نیکا کی سیاسی قلابازیوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"بہت اچھا خیال ہے ۔" میرے منھ سے جھلاہٹ میں نکلا ۔

"الدم بُگس ۔۔۔ کیا کہا بہت اچھا خیال ہے ۔ تم شاید سوشلزم میں یقین نہیں رکھتے ۔"

"میں سوائے قلندرازم کے کسی بھی ازم میں یقین نہیں رکھتا ۔"

"بچے ہو" وہ بڑے اطمینان سے بولے اور پھر اخبار پر نظریں گاڑ دیں ۔۔۔ مگر گاڑیں کہاں ۔ اگلے ہی منٹ پھر آواز اُبھری ۔ اب کی رُخ واجدہ کی طرف تھا ۔

"بیبی ۔۔۔ تم نے امریکہ اور فرانس کے طویل المدت سیاسی معاہدوں پر بھی کوئی لکچر اسکول میں سنا ہے ۔"

"نہیں چچا جان ۔۔۔ میری سمجھ میں سیاست نہیں آتی ۔"

"آجائے گی ۔۔۔ گھبراؤ مت میں نے تمھارے فادر کی یہ استدعا قبول کر لی ہے کہ ایک سال یہیں رہ کر تمھیں سیاست پڑھایا کروں ۔"

"میں بھی پڑھوں گا انکل ۔۔۔ بشرطیکہ آپ مجھے ٹنگا نیکا کی وجہ تسمیہ بتانے کا وعدہ کریں ۔"

"گڈ بوائے ۔۔۔ ضرور ضرور ۔۔۔ میں تمھیں سب کچھ بتاؤں گا اور لکھ لو ۔۔۔ ٹنگا نیکا کے بارے میں تمھیں اپنا خیال بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا ۔"

اتنے میں میاں خاور بھی آ پہنچے ۔

"اچھا تو آپ لوگ یہاں چھپے بیٹھے ہیں ۔۔۔" وہ غیر معمولی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے اور پھر باپ ہی کی طرح بلا اجازت تشریف فرما ہو گئے ۔

"ڈفر کہیں کے ۔۔۔ ان چھپنے کی جگہ ہے ۔" سر یاور گرجے ۔۔۔ "دیکھا تم لوگوں نے یہ گدھا ہر وقت پنک میں رہتا ہے ۔"

"اوہ ڈیڈی آپ بھی یہاں ہیں ۔۔۔ میں سمجھا تھا آپ جواہر لال جی کی تصویر کے آگے ڈنڈوت کر رہے ہوں گے ۔۔۔"

"کھال گروا دوں گا مارتے مارتے ۔ شیطان زادے ۔"

"یاور زادے ۔۔۔ ڈیڈی میں آپ ہی کا بچہ ہوں ۔۔۔ ویسے آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ سے تشریف لے جانے کی استدعا کروں؟ ۔۔۔ بُرا نہیں مانیے مائی سوپر ڈیڈی میں مس واجدہ سے "میرے محبوب" پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں آپ خواہ مخواہ بور ہوں گے ۔"

"تیرے فرشتے بھی مجھے یہاں سے نہیں اُٹھا سکتے ۔۔۔ دیکھ رہے ہو برخوردار ۔۔" سر یاور روہانسے کے انداز میں بولے ۔ نگاہیں مجھ پر تھیں ۔۔۔ "یہ نالائق میری اولاد ہے ۔۔۔ بائی گارڈ اس سے تو بہتر ہوتا کہ میں زندگی بھر کنوارا ہی رہتا ۔"

"آپ اب بھی خود کو کنوارا ہی تصور کر لیجیے ڈیڈی ۔۔۔ ممی کہہ رہی تھیں کہ وہ عنقریب آپ سے عدالت کے ذریعہ چھٹکارا پانے کی کوشش کریں گی ۔"

"بھونکتا رہ ۔۔۔ ہائیں ممی کہہ رہی تھیں ۔ ممی کے بچے تیری ممی یہاں کہاں ہے ۔"

"یہاں نہیں ۔۔۔ انھوں نے گھر ہی پر یہ بات کہی تھی ۔۔۔ آپ لیڈی ارشاد سے پوچھ لیجیے گا ان کے سامنے کہی تھی ۔"

"کہنے دو ـــ تو نالائق ہم زن و شوہر کے بیچ میں دخل دینے والا کون ہے ـــ ارے وہ تیری ممی تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"اسٹاپ ڈیڈی ۔ ۔ ۔" خاور نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلام کیا "ممی کی شان میں ایک لفظ بھی میں آپ کی زبان سے برداشت نہ کر سکوں گا ـــ"

"مت برداشت کر ـــ پھر تو کیا کرے گا؟" سرپاور کا انداز سوال قطعاً سنجیدہ تھا۔

"میں کیا کروں گا" خاور مصرعہ گنگنانے کے انداز میں بولا۔ "میں یہ کروں گا کہ گھر کو اسٹوڈیو میں تبدیل کر دوں گا اور پھر ایک ایسی پکچر بناؤں گا جس میں آپ کو کرکٹ میچ کے رانفری کا رول ادا کرنا ہوگا ـــ جی ہاں ـــ ڈیڈی میں سچ کہہ رہا ہوں"

"تیرا تو باپ بھی ۔ ۔ ۔ ۔ اُخ ۔ ۔ ۔ تیرے تو فرشتے بھی میری چھت کے نیچے شوٹنگ نہیں کر سکتے ۔ بڑا آیا پکچر بنانے والا ـــ"

واجدہ حیرت سے منھ کھولے کبھی باپ اور کبھی بیٹے کو تک رہی تھی ۔ مارے تحیّر کے اسے ہنسنے کا بھی ہوش نہیں رہ گیا تھا اور مجھ پر حیرت کی بجائے ایسی جھلاہٹ طاری تھی کہ بس ان دونوں کے کھوپڑے ایک دوسرے سے ٹکراؤں اور اونچے سُروں میں قوالی شروع کر دوں ۔

"سرپاور ! ـــ میرا خیال ہے آپ باپ بیٹے اپنا نام بدل ڈالیں ـــ ہرمز خرمز یا پھر چنڈو منڈو کیسا رہے گا ـ" میں نے تلخ سے لہجے میں پوچھا ۔

"گڈ آئیڈیا ـــ" خاور پھٹ سے بولا "ملا ابن حسن ڈیری گڈ آئیڈیا"

واجدہ بے اختیار ہنس پڑی ۔

"ملا ابن حسن نہیں بھائی صاحب ـــ مُلّا ابن العرب" اس نے تصحیح کی ۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا ـــ میں سمجھتا ہوں بھائی جان بہت پہنچے ہوئے ملّا ہیں ـــ ملّا بھائی آپ نے "میرے محبوب" تو دیکھ ہی لی ہوگی ـــ"

اب خاور گول گول آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔

"نہیں تو ۔ حقیقی مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں ۔ مگر گھبرائیے نہیں خاور اینڈ پاور پروڈکشن کی پہلی فلم میں ضرور دیکھوں گا ـــ یقین ہے آپ بیٹے کامیابی کا عالمی ریکارڈ توڑ دیں گے"

ایسی ہی بک بک میں بہت سا وقت برباد ہو گیا تھا اور پھر واجدہ کام کاج کے سلسلے میں اندر چلی گئی تھی ۔

شام کو اس نے میری استدعا پر جائے باہر ہی پی ۔ لیکن ان باپ بیٹوں نے بھی ہمارے ہی سر پر مسلط ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی ۔ ان میں سے کوئی ایک پہلے آتا اور پھر چند ہی منٹ بعد دوسرا آدھمکتا ۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ہم دونوں ہی سے کوئی ڈھنگ کی بات کرتے ۔ آپس ہی میں ایک دوسرے سے اوٹ پٹانگ باتیں کرنا ان کی شاید سب سے مرغوب تفریح تھی ۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ ہمیں لپیٹ میں ضرور لے لیتے ۔

اگلے روز ایک ایسے ہی موقعہ پر میں نے دانت کٹکٹا کے ان سے کہا تھا :ـ

"آپ دونوں اگر کسی الگ گوشے میں بیٹھ کر تفریح کر لیا کریں تو شاید آسمان نہیں پھٹ پڑے گا"

"یہاں بھی نہایت گھٹیا ذہن والے جمع ہو گئے ہیں برخوردار ـــ ایک تم ہو جو مجھے اونچے نظر آتے ہو ـــ تم نے کم سے کم ٹانگا ٹیکا پر اظہار خیال تو کیا ـــ مگر یہ لوگ ـــ ہُنہہ ۔ ۔ ۔"

"یہ فلمی اسٹائل ہے ڈیڈی" خاور بول پڑا ۔ ۔ ۔ "یہ جو آپ نے منھ کر کے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اسی ادا پر مس ہیرا منی کی فلم نے کھڑکیاں تڑوا دی تھیں ـــ"

"اور اب میرا گھونسہ تمہارے دانت توڑ دے گا ـ"

سرپاور نے گھونسہ بنا کر ہوا میں لہرایا ۔

"نہیں چلے گا ـــ آپ یقین کیجئے ڈیڈی اگر آپ جیسی عمر والے کو باکسنگ کا رول دے دیا گیا تو پبلک پردہ پھاڑ دے گی ۔ فرنیچر میں آگ لگا دے گی"

"اوہ ۔ ۔ ۔ میرے خدا ۔ ۔ ۔ اے خاور بیہودے ۔ میں تجھے گولی مار دوں گا ـــ دیکھ رہے ہو بیٹا ابنُ العرب ۔ یہ میرے بڑھاپے سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے"

اس بار واجدہ مارے ہنسی کے ڈھیری ہو گئی ۔ ۔ ۔ بمشکل ۔ ۔ ۔ لا

.....این الکھ...کھ...کھرب... یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کی ہنسی کی لہروں میں کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈول رہے تھے اور میں اپنے آپ کو اتنا بڑا گدھا محسوس کر رہا تھا جس سے اونٹ بھی پناہ مانگتے ہوں۔ بار الٰہا۔ یہ باپ بیٹے کیا واقعی انسانوں ہی کے کسی ریوڑ سے تعلق رکھتے تھے ــــ یا پھر یہ کوئی اور ہی مخلوق تھی۔

دن کے خوشگوار لمحوں میں زہر گھولنے کے بعد ان کمبختوں کو رات میں بھی چین نہیں تھا۔ سوتے سوتے بلبلاتے ــــ غرغراتے ــــ وہی اپنی مخصوص بکواسیں ــــ میں عاجز آگیا تھا۔ عاجز آنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ واجدہ بجائے بیزار ہونے کے ان میں دلچسپی لیتی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ احساس میرے لئے مرتے پر سو دُرّے کا مصداق تھا۔ یہی لگتا تھا جیسے وہ میری توہین کر رہی ہو۔

●

اگلی رات میں نے خواب دیکھا۔ ایک نہایت ہی مکلّف میز پر بڑی خوشنما پلیٹ میں چاندی کے ورقوں سے لپٹا ہوا حلوہ رکھا ہے اور پستہ، بادام وغیرہ کے تراشے بے افراط سے نظر آ رہے ہیں۔ میرا پیٹ بھرا ہوا تھا مگر نہ جانے جسم کے کس حصّے سے بھوک بھی جھانک رہی تھی ــــ ایسی بھوک جو پیٹ کی بھوک سے بالکل مختلف تھی۔ پھر یہ میرے سارے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ ایسا لگا جیسے دل، دماغ، روح سب پر دھواں سا چھاتا جا رہا ہے۔ میں نے بڑی بیتابی کے ساتھ حلوے پر ہاتھ ڈالا ــــ مگر اسی لمحے کہیں سے ایک بلند اور مضحکہ اڑانے والے قہقہے کی آواز آئی۔ میں ٹھٹک گیا۔ یہ آواز پہلے دور محسوس ہوئی تھی۔ پھر قریب آتی گئی اور آخرکار میں نے محسوس کیا کہ یہ تو میرے اپنے ہی اندر سے ابھر رہی ہے۔ حلوے کا بڑا سا نوالہ میری انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ دفعتاً قہقہے کی جگہ الفاظ نے لے لی۔ کوئی کہہ رہا تھا ــــ "کھاؤ ــــ خوب کھاؤ ــــ مگر خبردار دیکھنا مت ــــ آنکھیں بند کر کے کھا جاؤ ــــ"

ان الفاظ کا فوری ردّعمل یہ ہوا کہ میں نے انگلیوں میں پھنسے ہوئے لقمے پر بے اختیار نظریں گاڑدیں اور پھر ــــ دماغ چیخ کر رہ گیا ــــ یہ تو گوبر تھا!

میں نے بڑے زور سے ہاتھ جھٹکا جیسے اس پر بچھو چمٹ گیا ہو ــــ اسی لمحے ایک سسکی کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی جھٹکا ہوا ہاتھ مسہری کے چوبی تکیے پر اس زور سے پڑا تھا کہ کھوپڑی میں پورا آرکسٹرا بج اٹھا تھا۔

یہ مہمل سا خواب دیر تک ذہن میں چھایا رہا۔ چبھن شاید اس لئے بھی تھی کہ میری ہی قوتِ متخیلہ اس کے غبار آلود پس منظر میں ایک تعبیر بھی پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی ــــ ایسی تعبیر جو مجھے ناگوار محسوس ہوئی۔ میں نے سر کے بال مٹھی میں پکڑ کر کھینچے۔ مگر تعبیر کے دھندلے نقوش کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے۔

"تم بدمعاش اپنے سے بچ کر کہاں جاؤ گے ــــ" یہ کسی نے بڑے دل خراش لہجے میں کہا تھا۔ مگر کس نے کہا تھا یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ کہنے والا میری ہی کھوپڑی کے اندر کسی اندھیرے کونے میں چھپا بیٹھا تھا۔

"چپ جاؤ" میں دہاڑا ــــ مگر یہ دہاڑ حلق سے باہر نہیں آئی۔

"اور زور سے چیخو بڈھے بچے ــــ ہا ہا ہا... ہی ہی ہی ــــ"

یہ ہنسی کتنی وحشت ناک تھی ــــ اور یہ الفاظ ــ بڈھے بچے ــــ یہ تو جگر کو چیرتے ہوئے روح میں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اترتے چلے گئے تھے۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھیل گئیں۔ کتنا چاہا کہ سو جاؤں لیکن اسی نیم بیداری کے عالم میں چند سوالات ذہن کی بوجھل فضا میں مینڈکوں کی مسلسل ٹراہٹ کی طرح گونج اٹھے۔

"تم کیوں ان جھکّی باپ بیٹوں سے بیزار ہو ــــ حالانکہ تم خود جھکّی ہو ــــ تمھاری افتادِ طبع کے مطابق تو یہ تمھارے لئے بہترین سامانِ تفریح ہونے چاہئیں تھے؟ ــــ"

"تم کیوں ان کی حماقتوں کو خواہ مخواہ کسی سازش سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہو ــــ حالانکہ حماقت کے سوا تم نے

ان کے اندر کسی عیاری کی جھلک بھی نہیں دیکھی ؟ —"

"تم کیوں یہ چاہتے ہو کہ واجدہ بھی تمھاری ہی طرح ان سے بیزاری محسوس کرے اور جس انداز میں تم سوچتے ہو اسی طرح وہ بھی سوچے ؟" —

ان سوالات کا جواب میں نہیں دینا چاہتا تھا مگر نہ جانے اس وقت میری قوتِ ارادی کہاں گھاس کھا رہی تھی — مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دو وجود ہوں — ایک وہ جو ہڈی اور چمڑے کی شکل میں مسہری پر ڈھیر ہے — دوسرا وہ جو میرے کاسۂ سر میں ایک بڑی سی کرسی بچھائے جج بنا بیٹھا ہے۔

اور پھر اس جج نے سرد لہجے میں کہا :-

"ملزم — تم اپنے آپ سے چھپنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"یور شپ — میں ننگا ہوں — مجھے چھپ ہی جانے دیجئے —"

"یہاں بھی تم نے مکاری برتی — چالاک آدمی۔ یہ کھال جو تمھارے جسم پر چڑھی ہوئی ہے یہ بھی تو تمھارا لباس ہی ہے — ابھی یہ کھال کھرا دی جائے گی۔ ابھی تمھارے جسم پر کوڑے برسیں گے تب تمھیں معلوم ہوگا کہ ننگا کسے کہتے ہیں۔"

"نہیں … نہیں یور شپ — میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا —"

"ہر مجرم یہی کہتا ہے — خاموش کھڑے رہو۔"

پھر کرسی کے قریب واجدہ نظر آئی — وہ سفید سوٹ میں غیر معمولی حسین لگ رہی تھی۔

"جواب دو — بوڑھے بچے ! کیا تمھاری انتہائی خواہش یہ نہیں ہے کہ قسمت سے ہاتھ آئے ہوئے ان چند دنوں میں یہ لڑکی تمھارے ہی گرد پروانہ وار گھومتی رہے — کیا تم نہیں چاہتے کہ جب یہ تمھارے پاس ہو تو آس پاس کوئی نہ ہو — ؟"

"چاہتا ہوں جناب عالی ! — مگر آپ کو کیا — آپ کون ہوتے ہیں ایسی خواہشات پر معترض ہونے والے جو قانون کی رو سے جرم نہیں —"

"کس قانون کی بات کرتے ہو — یہ عدالت نفسیات کی عدالت ہے — یہاں صرف فطرت کا قانون چلتا ہے —"

"مگر فطرت معصوم قسم کی تفریحات پر روک نہیں لگاتی۔"

"تم ان ناپاک ہونٹوں سے معصومیت کا نام لیتے ہو جو موقع ملنے پر کچ لہو اور پیپ بھی چاٹنے سے باز نہیں رہتے۔"

"میں نہیں سمجھا جناب عالی۔"

"جھوٹ بکتے ہو — یوں کہو سمجھنا نہیں چاہتے — اچھا ٹھیرو — ابھی تمھارا مغز تمھاری کھوپڑی سے باہر نکال کر میز پر رکھا جائے گا اور پھر تم دیکھو گے کہ معصومیت کے حریری غلاف کے اندر گندگی کے کتنے کیڑے کلبلا رہے ہیں۔"

"میں اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا یور شپ — مجھے میرے سوا ہر چیز دکھلا دیجئے — میں اپنی لاش دیکھ سکتا ہوں مگر اپنے لاشعور کو بے پردہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تو تم نے اعترافِ جرم کر لیا" جج نے اطمینان کا سانس لیا — اس کے ہونٹوں پر ذومعنی تبسم کھیل رہا تھا۔

"نہیں — نہیں۔" میں چیخا۔

"پھر بلبلائے کیوں جاتے ہو۔ کیا وہی شخص تلاشی سے نہیں گھبراتا جس نے گھر میں چور چھپا رکھا ہو۔"

"بلبلا نہیں رہا ہوں۔ آپ کو کیا تکلیف ہے … اور … ہپ … یور شپ میں اپنے غیر پارلیمانی الفاظ کیلئے معافی چاہتا ہوں۔"

"بننے کی کوشش فضول ہے بوڑھے بچے …"

"اے جج صاحب — یہ میری چڑھ ہے کیا — بو … ڑھے … بچے۔" میں نے منھ چڑانے کے انداز میں یہ جان جلانے والے الفاظ دہرائے۔

"پھر تم کیا ہو — خیر خیر۔ ابھی یہ تمھاری کینچلی اتر جائیگی تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ ہر وہ نظر — جو تم نے اس لڑکی کے سراپا پر ڈالی ہے ایک اعلیٰ ترین مشین کی بلوری اسکرین میں محفوظ ہو چکی ہے — یہ مشین حسیات کے ایک ایک عنصر کو الگ کر کے رکھ دیتی ہے چاہے وہ لاشعور کے کتنے ہی پردوں میں چھپا ہوا کیوں نہ ہو —"

"لاشعور کے دادا — تمھیں جج کس نے بنا دیا۔ تمھیں تو کسی الّو کے پٹھے ماہر نفسیات کے دروازے پر چوکیداری کرنی چاہئے تھی۔"

"یہ طرارہ بھی اعتراف جرم ہی سے بڑھے . . . ."

"خبردار . . . . یہ لفظ اگر تم نے پھر دہرایا تو میں تمھیں گولی مار دوں گا ــــ صاف لفظوں میں کہو کہنا کیا چاہتے ہو ــــ"

"جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ تم پوری طرح سمجھ چکے ہو دغاباز ــــ پھر انگائے جانے سے فائدہ ؟"

"میں تمھیں بھی کرسی سمیت چبا جاؤں گا ــــ اے واجدہ اس کمینے کے پاس سے ہٹ آؤ ــــ یہ جج نہیں کوئی خبیث روح ہے ــــ"

"آگئے اصلیت پر ــــ" جج کا لہجہ پُرسکون تھا ــــ "آدمی آج بھی وہی جانور ہے بیٹے ملّا ــــ جو صدیوں پہلے بھیڑیوں اور کتوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا ــــ فرق بس اتنا ہے کہ آج اس نے ایک چمکدار خول چڑھا لیا ہے ـ تم نے تاریخ تو پڑھی ہوگی ـ کیا بھول گئے اسی دنیا میں دو حقیقی بھائیوں نے اس لئے بھی آپس میں جنگ لڑی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی حقیقی بہن کو بیوی بنانے کے درپے تھا ــــ"

"کیا بکواس ہے ــــ" میں چلّایا "ایک معصوم لڑکی کی موجودگی میں یہ گندی باتیں کرتے تمھیں شرم نہیں آتی ــــ اخ تھو . . . . ."

"کیا کریں ــــ ہم گڑ بر کو حلوہ کہنے کا فن نہیں جانتے ــــ تم لفظوں کے کھلاڑی ہو ــــ مگر ہماری عدالت میں فقط معانی چلتے ہیں ــــ بوڑھے بچے !"

دفعتًا ایک شعلہ سا اٹھا اور جج اپنی کرسی سمیت بھک سے اُڑ گیا ــــ واجدہ بھی فضا میں تحلیل ہوگئی ــــ میں نے دھڑ دھڑی لی ـ اتنے ہی میں سرخاور کی جانی پہچانی بڑبڑاہٹ کان سہلانے لگی ــــ

"مسلم لیگ مردہ باد ــــ پاکستان کا ایک بارہ سیٹوں والا جیٹ ہوائی جہاز تباہ ہوگیا ـ سولہ مسافر نذرِ اجل ــــ مرو سالو کسی طرح تو مرو ــــ ٹنگا ٹیکا . . . . ٹنگا ٹیکا . . . بھارت نشاں . . . . . ہم بلبلاں ـ"

پھر صاحبزادے ہی کیوں چیخ بند رکھتے ــــ وہ بھی بڑبڑائے "بنّاخ بٹیا چھکّا اُڑا دے ــــ اخ . . . . غ غرارہ بیگم . . . . کیمرے کی طرف مت دیکھو . . . کٹ . . . ستیاناس ــــ"

(باقی دارد)

سیرت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر تو اردو میں مبسوط کتابیں ملتی ہیں لیکن حضرت عثمانؓ کی مکمل سوانح سے اردو محروم رہی مگر اب یہ محرومی ایک دیدہ ور اہلِ قلم کی عرق ریزی نے کامرانی سے بدل دی ہے ـ دو حصوں میں تکمیل پائی ہوئی یہ کتاب نہ صرف سیرت عثمانؓ سے آگاہی بخشتی ہے بلکہ ان تمام کمزور اور بے بنیاد الزامات و اعتراضات کا بھی شافی جواب پیش کرتی ہے جو خلیفۂ ثالث، دامادِ رسولؐ عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر عائد کئے جاتے رہے ہیں ـ آپ کی شہادت اور اس کا پورا پس منظر بھی مؤلف نے بہت ابھار کر پیش کیا ہے ـ کتاب یقینًا اس قابل ہے کہ اسے پہلی فرصت میں پڑھا جائے ہر دو حصّہ مکمل دس روپے ـ

عبقات — اخلاقی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب ـ ترجمہ :- مولانا مناظر احسن گیلانی ـ ساڑھے دس روپے

فضائل علم و علماء — امام ابن تیمیہؒ کے لائق شاگرد امام ابن قیمؒ کی محققانہ کتاب ـ پونے دو روپے

آثار امامؒ — امام ابو حنیفہؒ کے جستہ جستہ احوال و واقعات کا ایک دلکش گلدستہ ڈھائی روپے ـ

انتخاب مکتوبات امام ربانیؒ — اپنے وقت کے امام حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان خطوط کا اردو ترجمہ جو دین و شریعت کے اسرار و رموز سے لبریز ہیں ـ خاصے کی چیز مجلد ـ ساڑھے پانچ روپے ـ

تحفۃ الموحدین — شاہ ولی اللہؒ کی ایک ایمان افروز کتاب ـ توحید خالص کی تصویر ـ بدعت و شرک کے لئے تلوار ـ صرف ۳۷ نئے پیسے ـ

آدابِ زیارت قبور — حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی تالیف زیارت قبور کے آداب ـ صرف ۳۷ نئے پیسے

مکتبۂ تجلی ـ دیوبند (یوپی)

کھرے کھوٹے

(تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں)

مسئلہ ختم نبوت علم وعقل کی روشنی میں

تالیف :- مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء ۔ لکھنو

- طابع وناشر :- معین الدین احمد ندوی واخوانہ
- صفحات :- ۱۵۸ لکھائی چھپائی غنیمت ۔ کاغذ سفید قیمت دو روپے ۲۵ پیسے

جس طرح یہ طے ہے کہ پورے عالم کو روشن کرنے والے ایک سورج کے بعد کسی دوسرے سورج کی ضرورت نہیں جس طرح یہ طے ہے کہ آنکھیں دیکھیں گی اور کان سنیں گے ۔ اسی طرح یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ خاتم النبیین ، سرورِ جن وانس محمد ابن عبداللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا ۔ نہ ظلی نہ بروزی ۔ نہ ضمنی نہ کسی اور قسم کا ۔ نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے مقفل ہوچکا ۔ اس قفل کی کنجی خالق کائنات کے پاس ہے اور قصرِ نبوت کی دیواریں اتنی بلند ہیں کہ انسان تو انسان اس کا طائرِ خیال بھی ان پر کمند ڈالنے کا تصور تک نہیں کرسکتا ۔

مگر آدمی جہاں " احسن تقویم " ہے وہاں اسفل سافلین بھی ہے ۔ دیکھئے شیطان جس کے کاسہ سر میں نشیمن بنالے وہ آدمی رہتا ہی کب ہے ۔ وہ تو قرآن کے لفظوں میں جانور بلکہ جانور سے بھی بدتر ہوجاتا ہے ۔ چنانچہ یہ جو آپ اسلام کی چودہ صدیوں میں وقتاً فوقتاً متعدد بناسپتی نبیوں کا ذکر سنتے آرہے ہیں یہ مسخرے فی الاصل آدمی کب تھے ۔ آدمی اگر فقط گوشت اور ہڈیوں کے مجموعے کا نام ہے تو سب سے بڑے آدمی ہاتھی اور بجار کہلانے چاہئیں ۔ آدمی تو فقط دو تولہ بھیجے کا نام ہے ۔ اس بھیجے کو شیطان اگر گوبر میں تبدیل کردے تو آدمی حیوانِ ناطق تو ضرور کہلائے گا مگر انسانیت اس کو چھوکر نہیں گذرے گی ۔

واقعہ یہ ہے کہ خاور نبوت محبطِ قرآن ، سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کسی نبی کی بعثت ممکن سمجھنا حماقت کی اتنی بڑی مقدار کا طالب ہے کہ جس کھوپڑی میں یہ مقدار جمع ہوگی وہاں بھیجے کے لئے شمہ برابر جگہ باقی ہی نہ بچے گی ۔

ابھی ماضی قریب میں بھی ایک بلند بانگ " نبی " گذرے ہیں ۔ تعجب ہے ان کے بعد کوئی اور " نبی " پیدا نہیں ہوا حالانکہ مسخرے پن کی تکمیل اسی صورت میں ہوتی کہ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی کوئی عورت دعوئے نبوت لے کر اٹھتی ۔ عورت کا دعوۂ نبوت مردوں سے زیادہ دلچسپ ہوتا ۔ یقین نہ آئے تو ماضی بعید کی تاریخ اٹھاکر دیکھئے ہمارا دعویٰ ہے کہ آج کے عورت زدہ دور میں اگر کوئی نوعمر اور قبول صورت عورت دعوۂ نبوت لیکر اٹھے تو وہ اس سے بڑی امت پیدا کرلے گی جتنی ماضی قریب کے ایک مرد " پیغمبر " نے پیدا کی ہے ۔

خیر تفنن برطرف ۔ تقسیم ہند کے بعد اپنے بھارت میں قادیانیت کا غل غپاڑہ دب سا گیا تھا مگر اب کچھ دنوں سے پھر یہ فتنہ انگڑائیاں لیتا نظر آرہا ہے ۔ اسی لئے زیرِ تبصرہ کتاب

کو ہم بے وقت کی شہنائی نہیں کہہ سکتے بلکہ اسے علماءِ حق کے زندہ احساس کی علامت قرار دیں گے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ تو ام العقائد کی حیثیت رکھتا ہے، اسے بیچ سے نکال دیجئے اسلام کا تناور درخت زمین پر آ رہے گا۔ اسکی طرف سے مدافعت اور اسکی حفاظت علماء اسلام کا فرض ہے۔ یہی فرض مولانا محمد اسحاق صاحب نے اس کتابچے کی صورت میں نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کا موضوع "ردِ قادیانیت" نہیں بلکہ "عقیدہ ختم نبوت" ہے —— مگر قدرتی بات ہے کہ بھرپور زد فتنۂ قادیان ہی پر پڑے گی۔ ویسے زد رفض و تشیع پر بھی پڑتی ہے۔ یہ مسالک بھی اپنی اصل کے اعتبار سے اسی فکری گمراہی کی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں جس کا ایک روپ فتنۂ قادیان ہے۔ حضور خاتم النبیینؐ کے بعد کسی کو صاف لفظوں میں نبی مانئے یا نبی نہ کہئے مگر "معصوم" قرار دیجئے کوئی ذرا فرق واقع نہیں ہوتا۔ پہلی صورت کو "ارتداد" کہیں گے اور دوسری کو "منافقت"۔

فاضل مؤلف نے کتنی فکر انگیز بات فرمائی ہے۔

> "عقیدہ امامت" بھی اس لئے اختراع کیا گیا کہ اس عقیدے (عقیدۂ ختمِ نبوت) کی دیوار میں رخنہ پیدا کر دیا جائے اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال عظمت کو دلوں سے مٹایا جائے غالباً بارہ کا عدد بھی بنو اسرائیل کے بارہ نقباء و اسباط کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے اور عقیدۂ "امامت" کے یہودی الاصل ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔"

واقعی بات پتے کی ہے۔ عقیدہ امامت میں مفروضہ اماموں کی "عصمت" بھی بنیادی قدر کا درجہ رکھتی ہے اور عصمت ہی وہ وصف خاص ہے جو پیغمبر اور غیر پیغمبر کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ یہ خط مٹا دو پھر جتنے چاہے نئی چٹکی بجاتے بنا لو۔

بات ضروری ہے کہ نئی نبوتوں کے فتنوں پر علماء کڑی نظر رکھیں اور عامۃ المسلمین کو اس دامِ فریب سے بچانے کے لئے اپنی مساعی کوششوں سے دریغ نہ فرمائیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس طرح تو تم عوام سے عقائد کی آزادی چھین لینا چاہتے ہو تمہیں کیا حق ہے کہ نئے نبیوں کے کاروبار میں ٹانگ اڑاؤ اور نئے "صحابیوں" کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاؤ۔

تو ہم جواب دیں گے کہ عقائد کی آزادی پر ہمیں اعتراض نہیں ہے۔ کوئی گروہ کتے اور خنزیر کو بھی پوجنے لگے یا ماوزے تنگ اور خروشچیف کو پیغمبر ماننے لگے تو ہماری بلا سے۔ ہمیں اعتراض دغابازی پر ہے۔ جھوٹ اور مکر و دغا پر ہے۔ یہ پرلے سرے کی جعل سازی اور فریب کاری ہے کہ ایک گروہ مومن و مسلم نہ ہو مگر خود کو مومن و مسلم کہہ کر اپنے عقائد کا پروپیگنڈہ کرتا رہے۔ محمد عربیؐ پر ہر طرح کی نبوت کا خاتمہ اسلام کے اساسی عقائد میں سے ہے بلکہ راس العقائد ہے۔ سر کاٹ دو آدمی مردہ کہلائے گا۔ جہاں کسی نے اس عقیدے سے بال برابر انحراف کیا دائرۂ اسلام سے خارج ہوا۔ اب اسے حق نہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہے۔ وہ اپنا نام جو چاہے رکھ سکتا ہے مگر مسلمان نہیں رکھ سکتا۔ رکھتا ہے تو دھوکہ دیتا ہے۔ کھلا فراڈ کرتا ہے۔ کیا دھوکہ بازی اور دروغ بافی جرم نہیں ہے۔ کیا ہم آزادیٔ عقائد کے نام پر جعل و دغا کو بھی انگیز کر لیں گے۔

فاضل مؤلف نے بجا فرمایا۔

> "تعجب خیز ہے طرزِ عمل ان حضرات کا جو صحابۂ کرام کے اس طرزِ عمل سے واقف ہوتے ہوئے بھی قادیانیوں کی حمایت فرماتے ہیں اور انہیں مسلمان کہتے ہیں۔ حد ہو گئی کہ یہ حضرات خود مرزا صاحب قادیانی کو باوجود ان کے کھلے ہوئے دعویٔ نبوت کے دائرۂ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں اور اس کیلئے انکی طرف سے عجیب و غریب تاویلات کر کے سعیٔ لاحاصل کرتے ہیں۔" (ص ۴۳)

کاش وہ بعض بزرگ ان فتووں پر توجہ فرما سکیں جو قادیانیت کے معاملے میں عموماً رواداری اور مفاہمت کا انداز اختیار کرتے رہے ہیں۔ رواداری اور مفاہمت اچھی چیزیں ہیں لیکن جب یہ دین و ملت کی اساسی اقدار پر قصاب کی چھری بن کر گریں تو ان کا نام بے حسی اور کمزوری رکھا جائے گا

حاصل تبصرہ یہ کہ زیرِ نظر کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم اور اپنے مندرجات کے اعتبار سے بڑی وقیع ہے (عامر عثمانی)

نکات القرآن

مولفہ:۔ جان محمد بلگرامی صاحب ۔ ناول سائز۔
صفحات ۳۲ ۔ کاغذ اوسط۔ کتابت طباعت بہتر۔ قیمت ۳۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ:۔ کتبخانہ اسلامیہ۔ نزد جامع مسجد۔ ابھاپور۔ بھوپال

اس مختصر رسالے میں قرآن مجید کے نظام ترکیبی کا تعارف اس انداز میں کرایا گیا ہے کہ نزول قرآن کے سلسلے میں مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم، سلسلۂ نزول، رموز اوقاف و رسم الخط، آیات، الفاظ اور حروف نیز زبر، زیر، پیش کی گنتی، مخارج حروف کا ابتدائی علم، فضائل قرآن اور آداب تلاوت سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ رسالے کو سوال و جواب کے اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔ جس سے اس کی باتیں آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ مؤلف نے کافی محنت اور لگن سے اس چھوٹے سے رسالے میں بہت کافی معلومات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ دین ایک آبائی ورثہ کی حد تک رہ گیا ہے اور لوگ کتاب و سنت کے لئے اجنبی ہوتے جا رہے ہیں قرآن پاک کا یہ تعارف بڑے کام کی اور ضرورت کی چیز ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ خدا کی اس آخری کتاب کی حفاظت کا انتظام خدا تعالیٰ نے کتنے عظیم الشان پیمانے پر کیا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب سوائے قرآن کے ایسی نہیں ملتی جس کے حروف اور اعراب تک کی گنتی محفوظ کر لی گئی ہو! کتاب قابل استفادہ و مطالعہ ہے۔

صفحہ ۳ پر آخری سوال "قرآن مجید تحریری ہے یا تقریری؟" اور اس کا جواب یہ ہے کہ "قرآن مجید تقریری ہے"۔ بات کو واضح نہیں کر سکا۔ اگر یہ مفہوم ہے کہ قرآن توریت کی طرح تحریری تختیوں کی شکل میں نہیں بلکہ وحی کی شکل میں نازل ہوا تو بات ٹھیک ہے۔ ورنہ نزول کے فوراً بعد قرآن پاک قلم و قرطاس کی منزلوں سے گذرتا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کتاب خود قرآن کے الفاظ میں "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں" ـــــ اور یہ کتاب لوح محفوظ میں مرقوم بتائی گئی ہے ـــ مختصر یہ کہ تقریری اور تحریری کا مطلب اس سوال و جواب میں غیر واضح رہ گیا ہے۔

صفحہ ۹ پر جو چارٹ دیا گیا ہے اس میں چارٹ کی پیشانی کے عنوانات اپنے خانوں سے ادھر اُدھر سرک گئے ہیں جس سے پیشانی بگڑ گئی ہے۔

صفحہ ۲۸ پر مکتبہ تعلیم القرآن کے طلباء کے جو تاثرات قرآن پاک کے بارے میں درج کئے گئے ہیں وہ بہت دلکش، فکر انگیز اور ایمان افروز محسوس ہوئے مثلاً:۔

- قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔
- اللہ تک پہنچنے کا سیدھا اور سچا راستہ اللہ کی کتاب ہی بتلا سکتی ہے۔
- جو شخص اپنے آپ کو اللہ کی کتاب کا محتاج سمجھ کر اس کا مطالعہ اور عمل کرے تو وہ اس کو اپنے علوم سے مالا مال کر دیتی ہے۔
- اگر کسی کو دنیا میں سب کچھ مل جائے جس کو وہ چاہتا ہے اور اللہ کی کتاب نہ ملے تو سمجھے کہ اس کو کچھ بھی نہ ملا۔ (ش۔ ن)

مسلمانوں کی ایجادیں

از محمد حفیظ صاحب پھلواروی۔ ناول سائز۔
صفحات ۵۴۔ قیمت ۸/
ناشر:۔ محمد سمیع اللہ۔ ملنے کا پتہ:۔ (۱) دفتر یونیکی و القصاف ۱۷۸۔ لیاقت بازار۔ کراچی۔ (۲) محمود عالم ۱۷۴/۱ محمود عالم کراچی ۲۴

اس مختصر سی کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ نئی ایجادات کے میدان کے اولین رہنما مسلمان تھے اور ایجادات کے ابتدائی دور میں انہوں نے کس قدر جودت طبع اور موجدانہ صلاحیتوں سے کام لے کر حیرتناک اور بڑی ایجادات کر لی تھیں۔ آج جس قدر حیرتناک ایجادات کا سہرا مغرب کے سر ہے یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ ان کی اولین داغ بیل مسلمان سائنسداں سب سے پہلے ڈال چکے تھے۔ جن میں سے بعض تو تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہیں اور بہت سی تاریخ کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ حالانکہ درحقیقت دنیائے مغرب ان سب کے لئے مسلمانوں ہی کی زیر منت ہے۔ کتاب میں یہ سب باتیں باقاعدہ حوالوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور مغربی مستشرقین مثلاً فلپ کے ہٹی کے اقوال کو ان کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے

کہ اس دنیا میں ایجادات کا کریڈٹ دینے کے سلسلے میں مغرب نے مسلمان سائنسدانوں کو نظر انداز کر کے کیسے کیسے تاریخی غبن کئے ہیں! لیکن اسلاف کے ان کارناموں کا تذکرہ آج ہم کس منہ سے کریں جبکہ ان اسلاف کے اخلاف تمام مسلم ممالک ہی مغربی قوموں کے دروازے پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی بھیک مانگنا اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے ہیں!!

مولف نے مسلم ایجادات کی حیرتناک کہانی کی کڑیاں ملانے میں کافی کتابوں کے صفحات چھانے ہیں لیکن ان ایجادات کی تیکنیک کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ یہ تذکرۂ ماضی حیرتناک ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز اور معلومات آفرین بھی ہو جاتا۔ (ش۔ ت)

گلشن شرافت

از سعید قریشی صاحب۔ ناول سائز صفحات ۸۰ کاغذ مٹیالا۔ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۵ ۷ نئے پیسے ملنے کا پتہ:۔ الیف۔ اے سعید۔ گجرات۔ مغربی پاکستان۔

تحفۂ بدیع

از سعید قریشی ایم اے۔ ناول سائز صفحات ۳۲۰ کتابت و طباعت جلی۔ قیمت قسم اول ۳/۵۰ قسم دوم ۳/- ملنے کا پتہ: مکتبہ رشیدیہ۔ رجسٹرڈ۔ گجرات۔ مغربی پاکستان۔

پہلی کتاب فارسی کی مشہور تصنیف کریما "کا اور دوسری کتاب فارسی زبان کے پند نامۂ شیخ فریدالدین صاحب عطار" کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ کریما ہو یا پند نامہ یا اسی قسم کی دوسری فارسی کی شاہکار ادبی کتابیں ان سب میں ادب اور مذہب کا قیمتی دو آتشہ مواد ملتا ہے۔ علم و حکمت کے ٹھوس نمونے ملتے ہیں دانائی اور روشن ضمیری کی جاں نواز اور ایمان افروز جھلکیاں ملتی ہیں۔ فارسی کے ان دفاتر پارینہ کو اردو میں ڈھالنے کا کام علم و حکمت کے گڑے خزانے کھود نکالنے کا کارنمایاں ہے۔ اس لئے کہ جس مسلم سلطنتوں کے غروب آفتاب کیساتھ اور مغربی زبان و ادب کے جدید ارتقا کی زد میں فارسی جیسی شگفتہ زبانیں پس منظر میں دبتی چلی گئی ہیں۔ خصوصاً اس کا قدیم ادب ماضی کی طرح حال سے دور ہو کر رہ گیا ہے۔ سعید قریشی صاحب نے ان دونوں کتابوں کو اردو کے دامن میں ڈال کر ایک علمی اور اخلاقی خدمت سرانجام دی ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ ان کے کام سے خلوص کی بو آتی ہے اور خلوص کے ساتھ کاوش اور کنجکاوی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ فارسی اشعار اور خیالات کے ثبوت میں قرآن و حدیث کے حوالے فٹ نوٹ میں دیکر انہوں نے لطف بالائے لطف کی فضا پیدا کر دی ہے اور عجم کی سرحدیں گویا عرب سے ملا کر فارسی کے ان جواہر پاروں کو ٹکسالی قدر و قیمت عطا کر دی ہے۔

اس منظوم ترجمہ میں شعریت اور غنائیت کا عنصر تو بیشک دب کر رہ گیا ہے اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے اصل اور ترجمہ میں کافی فرق اور بُعد پیدا ہو گیا ہے لیکن جہاں تک مفہوم کا تعلق ہے مترجم نے اصل کی روح برقرار رکھنے کی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔

مترجم نے خود بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ ان کو تنقیدی مشورے دیئے جائیں اور خود فریضۂ نقد و نظر کا تقاضا بھی یہی ہے اس لئے اب کچھ اس تقاضے کے تحت عرض کر دینا ضروری ہے:۔

(۱) دونوں کتابوں میں کتاب و سنت کے حوالے دیئے گئے ہیں لیکن یہ حوالے ان کے اردو ترجمہ کی شکل میں ہیں۔ قرآن پاک کے سلسلے میں سورت، پارے اور آیتوں کے حوالے ملتے ہیں۔ مگر احادیث کا کوئی ایسا حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ یہ بات درست نہیں۔ کتاب و سنت کی سند مکمل حوالوں کے ساتھ ہونی چاہئے ۔۔۔ خصوصاً احادیث میں اس کے بغیر یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ فن کے اعتبار سے یہ کس درجہ کی حدیث ہے۔ اسی طرح آیات قرآنی میں اعراب کا التزام ہونا چاہئے۔ یہ دونوں باتیں اس فرض کے گہرے مقادمیں جاتی ہیں جو ہم سب پر کتاب و سنت کی حفاظت اور ان کے سلسلے میں محتاط کلام کرنے کے ذیل میں عائد ہوتا ہے۔

(۲) تحفۂ بدیع کے صفحہ ۱۷۹ پر فارسی شعر کا یہ ترجمہ

صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

آنکہ باتو روزِ غم ہو دست یار — روزِ شادی ہم بپرسش زینہار

ترجمہ:- وہ جو تیرے غم کے دن ہوتا ہے یار، وہ خوشی کے دن بھی پوچھے بار بار۔

حالانکہ " روزِ شادی ہم بپرسش زینہار "کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خوشی کے موقعہ پر بھی ضرور پوچھا جائے نہ کہ وہ پوچھے۔

دونوں کتابوں پہ نظرِ ثانی کر کے اس قسم کے مواقع کی اصلاح ہونی چاہئے۔ ترجمہ میں کچھ نہ کچھ حذف و اضافہ تو جائز ہے مگر تبدیلی کی حد تک تصرف جائز نہیں۔

مثلاً " ابلہ است آنکو بگفتن راغب است "کا ترجمہ " ہے وہ ناداں جس نے الٹی بات کی "— "بگفتن راغب است "کا ترجمہ "الٹی بات کرتے "، کے الفاظ سے الٹ سا جاتا ہے۔

(۳) " اعلیٰ مدارج پر جانشین فرماتے ہیں " صفحہ ۳۸ —— یہاں جانشین فرماتے ہیں کے بجائے " فائز فرماتے ہیں " ہونا چاہئے —— یا گلشن شرافت کے صفحہ ۷ پر " مجھے فارسی علم پڑھایا" "علم پڑھایا"، کی جگہ " فارسی کی تعلیم دی " ہوتا —— اسی قبیل کی لسانی غلطیاں دور کرنے کی سعی مزید درکار ہے۔

(۴) گلشن شرافت کے صفحہ ۲۰ پر " کریما ہے بند خدائے سخن " دیکھا تو کریما کے مصنف کے لئے " خدائے سخن "، کا لفظ غیرتِ توحید اور اسلامی رگِ حمیت پہ بار گذرا۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ " خدائے سخن "، جس مفہوم میں کہا جا رہا ہے وہ " خدائے یگانہ " سے مختلف ہے۔ پھر بھی کھٹکتا ہے۔ یہ استدلال یہاں درست نہ ہوگا کہ " خدائے سخن "، کا لقب تو بعض اور شاعروں مثلاً نوح ناروی کے لئے بھی مشہور ہے۔ عام فضا میں مذہبی احساسات کی پروا کون کرتا ہے۔ مگر آپ کو کرنی ہی چاہئے۔ (ش۔ ن)

معاشرۃ الزوجین

از:- قاضی عبد السلام تلیانی صاحب۔ ناول سائز، صفحات ۸۰ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:- اے۔ آر۔ تلیانی اینڈ سنز، ۸۰ پالکا میلفنش۔ بھنڈی بازار، بمبئی ۳

یہ کتاب اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ازدواجی زندگی کے معیاری کردار کی نشان دہی کرتی ہے۔ ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی حالت کیسی سقیم تھی اور اس کو جاہلیت کفر نے کس طرح جیتے جی مار ڈالا تھا —— اسی سلسلے میں مصنف نے بڑی دلسوزی کے ساتھ عرب کے کافرانہ معاشرے کے بعض خون چکاں واقعات کا ذکر کر کے عورت کی ستم رسیدگی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس کے بعد اس جاں نواز تاریخی انقلاب کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام عورت کے نوجیون کے لئے اپنے ساتھ لایا۔ اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کی سماجی لاش میں زندگی کی نئی روح پھونک کر اس کو جہادِ زندگی کے ہر مورچہ پر کس طرح فعال اور متحرک کردار میں ڈھال دیا تھا۔ کتاب کے اگلے صفحات میں اصل موضوع کو پیش کیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں میاں بیوی کے باہمی فرائض اور حقوق کیا ہیں اور مرد اور عورت ایک دوسرے کے اخروی مفادات کے سلسلے میں آج کل کہاں کہاں کوتاہ کار ثابت ہو رہے ہیں اور اس طرح اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے ازدواجی زندگی کو ان برکات سے محروم کر رہے ہیں جس کی ضمانت اسلامی تعلیمات نے دی ہے۔ مصنف کے دل میں سوز ہے۔ دماغ میں نکتہ سنجی اور حقیقت جوئی کا مادہ ہے اور قلم میں سادگی کے ساتھ ہلکی ہلکی ادبی چاشنی ہے۔ کہیں کہیں زبان و ادب کی غلطیاں بھی ہوئی ہیں مگر شاذ ——

مثلاً صفحہ ۲۳ پر " حد درجہ کا برا سلوک کیا جاتا "، حد درجہ برا سلوک " ہونا چاہئے۔ یا اسی صفحہ پر " وہ واقعات سن کر یا پڑھ کر دل دھڑک جاتے ہیں "، کی بجائے " دل ہل جاتے ہیں " یا " دل تیز دھڑک اٹھتے ہیں "، کا محل ہے یا صفحہ ۲۶ پر " کارِ قبیحہ "، کے بجائے " امورِ قبیحہ " کا الفاظ ہونے چاہئیں۔ اس قسم کی غلطیاں جیسا کہ عرض کیا گنتی کی ہیں۔ صفحہ ۱۸ پر " افسانہ نگاروں کے کی نظر میں " کتابت کی غلطی سے " کے کی "، دونوں چھپ گئے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب یقیناً استفادے اور مطالعہ کے لائق ہے۔ (ش۔ ن)

بلات دھرم پرورتن اسلام ورُدھ

(ہندی) از:۔ ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔
ناول سائز۔ صفحات ۳۵۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ (۱) مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف۔ ضلع پٹنہ۔
(۲) دارالاشاعت۔ رحمانی خانقاہ۔ مونگیر۔

امام الدین صاحب رام نگری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ آزادی کے بعد کے دور میں جس طرح مسلسل ہندی میں اسلام کی اشاعت اور اسلام کے دفاع کا کارگراں سرانجام دے رہے ہیں حقیقت یہ ہے اس کے سلسلے میں ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ اسلام جبر واکراہ تبدیلِ مذہب کا کس قدر مخالف ہے۔ کتاب کا مقصد تحریر یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ آزادی کے بعد ہندوا ور مسلمانوں کے ہاتھوں بالجبر مذہب تبدیل کرانے کے واقعات ہو رہے ہیں اس لئے دنیا کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا ہے تو اس کا اسلام اور اس کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ــــ اسلام کے سلسلے میں غیر مسلموں کی اس دیرینہ غلط فہمی کا ازالہ تو بہر حال قابل قدر کام ہے کہ اسلام زور زبردستی سے پھیلا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں آسکا جہاں مسلمانوں نے زبردستی کسی غیر مسلم کو مسلمان کرنے کی جسارت دکھائی ہو ــــ بہرکیف اسلام کی حقیقت سے غیر مسلموں کو روشناس کرانے کے لئے یہ کتاب اشاعت اور تعاون کی پوری طرح مستحق ہے۔ کتاب آسان اردو میں ہے اور رسم الخط ہندی کر دیا گیا ہے۔ حسب ضرورت ہندی الفاظ بریکٹ میں دیدئے گئے ہیں تاہم صفحہ اوّل پر خدا کے لئے "جنم داتا" کا لفظ کھٹکا اس کے اندر تراشندہ کا مفہوم آجاتا ہے خالق کا نہیں۔ اس کے بجائے "سرجن ہار" کا لفظ ہونا چاہئے تھا۔

خدا ناشرین کا بھلا کرے جنہوں نے الگ سے ایک مطبوعہ خط میں ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ ہندی داں دوستوں کو اسلام کے متعلق یہ رسالہ اور دوسرا اس سے قبل کا لٹریچر طلب کرنے پر مفت روانہ کیا جائے گا۔ (ش۔ ن)

دی میسج آف ہیومینیٹی ٹو دی ایسٹ اینڈ دی ویسٹ"۔ (انگریزی)

از:۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب۔ ناول سائز صفحات ۳۰۔ قیمت درج نہیں۔
شائع کردہ۔ اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ نمبر ۷۔

ڈاکٹر سعید رمضان کے قائم کردہ اسلامک انٹرنیشنل سینٹر کی منتظمہ کے ممبر کی حیثیت سے مولانا علی میاں نے یورپ کا سفر کیا تھا تو اس موقع پر یونیورسٹی آف لنڈن یونین کے سامنے یہ تقریر عربی میں کی تھی جس کا انگریزی ترجمہ یہ کتابچہ ہے۔ اس کتابچہ میں مولانا نے بتایا ہے کہ جس طرح مغرب نے خارجی دنیا کو اپنے فکر و تجربات کا موضوع بنایا ہے اسی طرح مشرق نے "انسان" پر اپنے مطالعہ و تجربات کی نظر مرکوز کی ہے۔ لیکن بُرا ہو مشرق و مغرب کی ذہنی تقسیم پسندی کا کہ اسی نے مغرب کے لئے مشرق کے اس قیمتی خزانے سے مستفید ہونے کے راستے میں فولادی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مواد، زبان اور اسلوب کے لحاظ سے اس کتاب میں مولانا کی تمام خصوصیات کتابچہ کے مطالعہ کی بھرپور دعوت دے رہی ہیں۔ اور مولانا کے مخصوص مضمون تاریخی جائزے نے اس کو کافی ٹھوس اور مولانا کے طرزِ بیان کی گہرائی نے کافی دلکش اور جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔

صفحہ ۱۲ پر مولانا نے لکھا ہے کہ:۔

"مشرق کے پیغمبروں نے خود کو کائنات میں پائی جانے والی قوتوں کو کھوج نکالنے قابو میں کرنے اور استعمال کرنے کے کام سے وابستہ نہیں رکھا۔ نہ ہی انھوں نے آلات یا مشینیں کو ایجاد کیا۔ ان کی توجہ اس پر مرکوز رہی کہ انسان میں اعمالِ صالحہ کی روح پھونکی جائے اور اس میں جینے اور کارِ خیر

انجام دینے کا عزم پیدا کیا جائے۔"
"PROPOHET" کا لفظ اگر مذہبی زبان میں استعمال ہو رہا ہے
جیساکہ اصولاً ہونا ہی ہے تو اس سے مراد پیغمبر ہوں گے اور
پیغمبروں کا موقف مشرق اور مغرب کی امتیازی حد بندیوں
کے بغیر سب جگہ یکساں طور پر ہی رہا ہے۔ اس میں مشرق کی
تخصیص سمجھ میں نہیں آئی۔
صفحہ ۹ پر دوسرے پیراگراف کی پہلی سطر میں "ON" کی جگہ
"NO" چھپ گیا ہے۔ کتاب فکر انگیز ہے اور تعمیر ذہن کیلئے
بہت مفید اشاریہ کا درجہ رکھتی ہے۔ (ش۔ ن)

فرینڈس ڈائری ۱۹۶۴ء FRIENDS - DIARY

پاکٹ سائز۔ قیمت درج نہیں۔
ملنے کا پتہ: (۱) فرینڈس سوسائٹی۔ ۳۹۶/۶ ہمایوں باغ کانپور
(۲) مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ سے بھی مل سکتی ہے۔
خوبصورت پلاسٹک کور میں سفید کاغذ پر نیلگوں طبع
والی یہ سال رواں کی ڈائری انگریزی میں ہے۔ عیسوی، ہجری
اور بکرما دیتہ سمبت کے لحاظ سے ہر دن اور تاریخ کے ساتھ
ساتھ نشان دہی کرتی ہے۔ طباعت پاکیزہ ہے۔ معنوی حسن
میں خصوصی اضافہ کے لئے ہر صفحہ کے زیریں حصے میں کتاب وسنت
کی مختصر اور ایمان افروز عبارتیں اقوال وحکمت کے طور پر درج
ہیں۔ اس کے علاوہ تعطیلات کی فہرست، ڈاک کے مختلف نرخ
اور برٹش اور میٹرک اوزان کی تحویل بھی دی گئی ہے۔ اس طرح
یہ ڈائری ہر جہتی لحاظ سے مفید اور کارآمد ہو جاتی ہے۔ بڑا اچھا
ہوتا اگر قرآن وحدیث کے اقتباسات کے ساتھ ان کا مختصر
حوالہ بھی دیدیا جاتا۔ یہ کتاب وسنت کے تحفظ کے لئے بے حد
دور رس نتائج پیدا کرنے والی احتیاط ہے۔ ۶ جنوری کے
صفحہ پر یہ عبارت ہے کہ "غیبت کرنا آدمی کا گوشت کھاتا
ہے" یہاں قرآن کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ یہ قرآن کے الفاظ
نہیں۔ قرآنی بات کو اپنے الفاظ میں ملخص کیا گیا ہے۔ اس میں
یہ غلطی رہ گئی کہ قرآن غیبت کو "مردہ بھائی کا گوشت کھانا" بتاتا
ہے نہ کہ آدمی کا۔ گو کہ معمولی سی تاویل سے ان دونوں باتوں کو
ایک ہی مفہوم دیا جا سکتا ہے لیکن خوبی اسی میں ہے کہ نقل
تاویل کی ضرورت سے بے نیاز رہے خصوصاً قرآن کی نقل
کہ وہاں تو ایک ایک حرف انمول ہوتی ہے۔
ویسے خلاصہ تبصرہ یہی ہے کہ ڈائری بڑی دلکش اور
جاذب ہے خصوصاً انگریزی داں طبقہ کے لئے اور عموماً
ڈائری کے تمام شائقین کے لئے۔ (ش۔ ن)

الہدیٰ بلیٹن نمبر ۱ (انگریزی میں) موسوم بہ "سروس آف ہولی قرآن" (خدمت قرآن کریم)

ناول سائز صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔
شائع کردہ: اسلامک لٹریچر پبلشنگ ہاؤس
زانہ۔ اے۔ جے۔ خلیل صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل ایڈووکیٹ
بسونگڈی۔ بنگلور نمبر ۴۔
یہ اے۔ جے۔ خلیل صاحب کی بے پناہ کاوشوں اور مذہبی
جذب وجنوں کی برکت ہے کہ بنگلور میں "الکتاب کوآپریٹو سوسائٹی"
کی سرکردگی میں اسلامی تبلیغ کا ادارہ "اسلامی لٹریچر پبلشنگ
ہاؤس" کے نام سے قائم ہوا جس کا مقصد دنیا کی تمام بڑی
زبانوں میں اسلام کی تعلیمات بالخصوص قرآن کے پیغام کو
عام کرنا ہے۔ اس ذیل میں حج کے عالمگیر اجتماع کے موقعہ
پر اسلامی لٹریچر کی عالمی نمائش بھی پروگرام میں داخل ہے۔
یہ بلیٹن اسی جدوجہد کا مفصل تعارف نامہ ہے۔ اس بلیٹن
میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حفظ الرحمن
صاحب مرحوم ومغفور اور حافظ ابراہیم صاحب منسٹر، پنڈت
سندرلال کی وہ آرا بھی دی گئی ہیں جو ان لوگوں نے اس
ادارے کا معائنہ کرنے کے بعد ملک کے سامنے رکھی ہیں۔
ان میں اس ادارے کی زبردست توانائی، مساعی، افادیت
اور خاص طور پر اس کے روح رواں اے۔ جے خلیل صاحب
کے جذبۂ عمل اور صلاحیت کارکردگی کو تہ دل سے سراہا گیا ہے
علاوہ ازیں ملک اور بیرون ملک کے مختلف اہل علم حضرات
اور علمی وتعلیمی اداروں کے دو خطوط بھی درج کئے گئے ہیں
جن میں ادارے کی کتابوں کو اسلام کے مطالعہ کے لئے بیحد

سود مند بناتے ہوئے ادارے کیلئے خیر اندیشانہ نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا ہے۔ ادارے کی شائع شدہ اور زیر اشاعت کتابوں کے اعلان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اسلام کے ذی صلاحیت اور جوشیلے کارکنوں کا ادارہ ہر زاویے سے غیر مسلم دنیا تک اسلام کی تعلیمات پہونچانے کا عزم بالجزم کئے ہوئے ہے۔ خدا اس ادارے کو نفس و شیطنت کی نظریہ اور فکر و نظر کے انحراف و تجاوز کے شر سے محفوظ رکھے اور اس کو تاریخ میں اسلامی تبلیغ کا مینارۂ نور بنائے۔ ضرورت ہے کہ ملت مرحومہ کے دردمند حضرات درمے قدمے، قلمے اس ادارے کے ساتھ تعاون کرکے آخرت کیلئے زادِ راہ کی اچھی تیاری کریں اور اس سوسائٹی کے تخصص کاروباری "میں شرکت کرکے اس مہم کو آگے بڑھائیں۔

پنڈت سندرلال جیسے لوگوں کی" رائے "میں ادارہ سے یہ توقع لگائی گئی ہے کہ وہ وحدت ادیان کی خدمت کر سکے گا۔ اول تو ہمارے نزدیک ایسے حضرات کی آراء کا سہارا لینا ہی محل نظر ہے جو اسلام کو جزوی طور پر پسند کرتے ہوں مگر کلی طور پر اس کو قبول کرنے کو ناپسند کرتے ہوں — جو گیتا کو ہندوستان کا قرآن اور قرآن کو "عرب کی گیتا" کہنا اور سننا پسند کرتے ہوں — درآں حالیکہ گیتا کا اوتارواد اور قرآن کے توحید خالص کے تصور میں بعد المشرقین ہے۔ اس کے علاوہ وحدت ادیان کا نظریہ جتنا نظر فریب نظر آتا ہے اتنا ہی گمراہ کن بھی ہے اس نظریے کو اپنانے کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں کہ کتاب کے کچھ حصوں پر ایمان لایا جائے اور کچھ حصوں پر ایمان نہ لایا جائے — تحریف شدہ حصے جو مسخ شدہ صحائف اور قرآن غیر محرف کے درمیان مستحکم حدِ فاصل کھینچتے ہیں ادارے کو اگر توحید خالص اور ابراہیم و مصطفےٰ کے پیغام کی خدمت کرکے آخرت کے ٹھکانے کی فکر ہے تو ان خطر پوش راہوں سے سلامتی ہوش و حواس اور بکمال احتیاط گذرنا چاہیئے۔

ساؤتھ انڈیا کی کسی ہندو تیرتھ گاہ کے اجتماع کے سامنے ادارے کی طرف سے اسلامی تعلیمات کے تعارف میں بھی تقریر یا تحریر کو صفحہ ۱۳۱ سے متعدد صفحات تک نقل کیا گیا ہے اس میں بھی یہی نظر آتی ہے کہ ویدوں اور قرآن میں جو تعلیمات متوازی اور یکساں ملتی ہیں ان کو تو دہرایا گیا ہے۔ مگر وہ توحید خالص اور دین حنیف کے گوشے نہیں دکھائے گئے جو باقی تمام مذہبی کتابوں میں سے ناپید ہو گئے اور صرف قرآن میں باقی رہ گئے ہیں۔ متوازی تعلیمات کے ساتھ ساتھ، مخالف اور متصادم تعلیمات بھی صفائی کے ساتھ منظر عام پر لائی جائیں — تاکہ غیر مسلم دنیا جس دولت کو کھو چکی ہے اسکی بازیابی کی سعادت حاصل کر سکے۔ ورنہ جو تعلیم ان کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اسی کو اُٹھا کر پیش کر دیا جائے تو ان کے ہاتھ کونسی نئی شے آئی اور انکے کس آخرت سوز گھاٹے اور نقصان کا تدارک ہوا؟۔

مجموعی طور پر یہ پبلیشن پڑھنے کی چیز ہے۔ اس کو پڑھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ کام کرنے والا ایک آدمی بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو کس طرح انجمنوں اور جماعتوں کی مکمل نیازمندیوں کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ (ش - ن)

پندرہ روزہ "برادری" لکھنو کے تین ماہانہ ایڈیشن

• ماہانہ ایڈیشن بابت اگست ۱۹۶۱ء کتابی سائز - ۴۲ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے

• حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ

(خاص نمبر) بابت جنوری ۱۹۶۲ء صفحات ۱۰۸

از :- سلام اللہ صدیقی صاحب :-

قیمت غیر مجلد — ۱/۲۵ مجلد بہتر کاغذ پر — ۱/۵۰

• اسبابِ زوالِ اُمّت

(از :- علامہ شکیب ارسلان) صفحات ۴۴ قیمت ۷۵/-

ملنے کا پتہ :- مکتبہ انسانی برادری - سعادت گنج - لکھنو

— (کتاب "حضرت معاویہ بن ابی سفیان" مکتبہ تجلی سے بھی مل سکتی ہے)

——— (۱) ———

اگست ۱۹۶۱ء کا ماہانہ ایڈیشن کسی خاص موضوع پر نہیں ہے۔ اسلامیات - معلومات عامہ، حفظان صحت، تہذیب و معاشرت، تاریخ و تذکرہ اور طنز و مزاح پر گوناگوں مطالعہ

(باقی صفحہ ۹۴ پر)

کیمونزم کے خدوخال نمایاں کرنے والی کتابیں

عثمان بطور

چین کے مجاہد عثمان بطور اور ان کے ساتھیوں کی ولولہ انگیز سرگزشت۔ جن کے مجاہدانہ کارناموں نے اسلام کے دور اول کے مجاہدوں کی یاد تازہ کر دی۔ ان مجاہدوں کی سرگزشت جنھوں نے اپنے مذہب اور معاشرے کو الحاد کی یلغار سے بچانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ مترجم شاہد احمد دہلوی۔ ۲۵۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

آج کا چین

مشہور ہندوستانی عالم ڈاکٹر ایس چندر شیکھر کا سوز میں کمیونسٹ چین کی زندگی کے ہر پہلو کا بیرحاصل تجزیہ۔ مترجم مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ

سرگزشت امام

چین کے مشہور امام کا ہونہار نوجوان کی آپ بیتی۔ جو اسلام کی خدمت کرنے کا مکہ سے چین گئے اور خدمت دین کی پاداش میں کمیونسٹ مظالم کا سامنا کیا۔ مترجم محمد صغیر صاحب مدیر روزنامہ دعوت دہلی۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۵۰ پیسے۔

چین کے مسلمان

معلومات افزا کتابچہ چینی مسلمانوں کے تاریخی حالات اور ان کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ ۴۰ صفحات۔ قیمت ۲۵ پیسے۔

پتھر کے دیوتا

دنیا کے چھ مشہور ادیبوں کی آپ بیتیاں۔ ان آپ بیتیوں میں انھوں نے ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو کیمونزم پر ایمان لانے کے محرک بنے۔ اس کے بعد انھوں نے اس روحانی کرب کا ذکر کیا ہے جس نے ان کے ایمان میں رخنے ڈال دیے۔ مترجم گوپال متل۔ ۲۴۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

آزادی کی طرف

ایک ممتاز روسی افسر ڈاکٹر کراﺅ شینکو کی انکشاف انگیز آپ بیتی۔ یہ کتاب جتنی انکشافات انگیز ہے اتنی ہی دل چسپ بھی ہے۔ ایک بار شروع کر کے اسے ختم کیے بغیر آپ ہاتھ سے نہیں رکھیں گے۔ مترجم سید نورالحسن کر۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

ظلمت نیمروز

ایک ایسے ملک کی لرزہ خیز کہانی جو آرتھر کوسلر کی انقلابیوں کے ہاتھوں میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ روس کے ایک انقلابی رہنما کی روداد اسیری جس نے اپنی بے گناہی کے باوجود موت کی سزا پائی۔ اور اقبال جرم کے بعد۔ مترجم گوپال متل۔ ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

اور یانگسی بہتا رہا

دو معصوم دلوں کی کہانی جو سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیے گئے۔ جن کے مستقبل کے حسین خواب اور بہتر زندگی کی معصومانہ آرزوؤں کو کمیونسٹ حکمرانوں کے تعصبات کا سیل اور غضب ناک یانگسی کی طوفانی لہریں بہا لے گئیں۔ مترجم جلیس عابدی۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

آزادی کا ادب

ہندوستان اور پاکستان کے بہترین شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی منتخب تحریریں۔ مرتب گوپال متل۔ قیمت تین روپے۔

ادب میں ترقی پسندی

ترقی پسند تحریک کا بے لاگ تاریخی اور نظریاتی جائزہ، گوپال متل کے قلم سے۔ اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب جس کا ترجمہ کئی غیر ملکی زبانوں میں ہوا۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ انگریزی ایڈیشن دو روپے۔

سورما کی ہار

نیکی اور بدی کی ازلی کشمکش کی خیال افروز داستان۔ موجودہ صدی کا ایک عظیم ناول۔ روسی ادب کا شاہکار۔ مترجم گوپال متل۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔

لینن

انقلاب روس کے بانی نکولائی لینن کی مستند ترین سوانح عمری۔ لینن سے قریبی ربط رکھنے والے انقلابی ڈیوڈ شوب کے قلم سے۔ مترجم گوپال متل۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

عالمی سیاست میں جمہوریت

بین الاقوامی سیاست میں جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ۔ موجودہ عالمی سیاست کے پرپیچ رجحانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ مترجم گوپال متل۔ ۱۱۰ صفحات۔ قیمت ۵۰ پیسے۔

انیس سو چوراسی

جارج آرویل کا عظیم ناول جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر نظام جبر کو نہ روکا گیا تو آگے چل کر کتنا بھیانک ہو جائے گا۔ ۱۹۸۴ء میں دنیا کا جو نقشہ ہو سکتا ہے، یہ اس کی بھیانک تصویر ہے۔ مترجم سید سہیل واسطی۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔

اس پتے سے منگایئے: مکتبہ تجلی۔ دیوبند ضلع سہارن پور (یو۔ پی)

مفہوم القرآن

ترجمۂ قرآنِ پاک نظم میں

مختلف مکتبۂ فکر کے علمائے کرام کا مصدقہ

- ایک صفحہ پر عربی متن، ترجمہ اور تفسیر شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ
- سامنے کے صفحہ پر کیف بھوپالی کی نظم

سہ رنگا حسین سرورق؛ دو رنگوں میں عکسی طباعت
ہر پارہ الگ الگ جلد میں

پارۂ عم چھپ کر تیار ہے ● ہدیہ فی جلد تین روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

شائع کردہ معراج پبلیکیشنز شیخ سلیم گیٹ وارانسی (یو۔پی)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ "تجلی" دیوبند (یو۔پی)